فائزہ افتخار

دوسری قسط ۲

ام ہانی کے تلووں کے نیچے جیسے انگارے بھرے ہوئے تھے زمین پہ لگا ہی نہیں پا رہی تھی بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑتی ہوئی بند دروازے کے اس پار پہنچ کے سعد سے اس کی ناراضی کا سبب پوچھ لے۔ حالانکہ پوچھا گیا... جانتی تو وہ تھی مگر پوچھتی... جواب سنتی... تب ہی منانے اور وضاحت دینے کی نوبت آتی نا... مگر پھر اس کے چلتے چلتے پیر تھم گئے۔

اس کے اور بند دروازے کے بیچ مہ پارہ پھوپھو کھڑی اسے خشمگیں نظروں سے گھور رہی تھیں۔

"یہ وقت ہے تمہارے گھر لوٹنے کا؟"

ہمیشہ کی طرح ان کے سرد الفاظ سے زیادہ ان کے برفیلی نظروں نے اسے حواس باختہ کر دیا۔

"جی وہ پھوپھو پتا نہیں کیسے دیر ہو گئی دھیان ہی نہیں رہا۔"

نظریں، جواب دینے کے دوران بھی ان کے پیچھے والے بند دروازے پہ دستک دے رہی تھیں۔

"دھیان قابو میں رکھا کرو بی بی۔ اتنی اوسان خطا کرنے اور آپے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے فاختاؤں کو زیادہ اونچی اڑان بھرنا راس نہیں آتی۔ ایک بلندی پہ جانے کے بعد وہ اندھی ہو جاتی ہیں۔"

"جی؟"

اس کی حیران نظروں میں مزید ہراس پیدا ہوا۔

"ولایت جانے کے خیال سے ہی تو اڑی اڑی پھر رہی ہو۔ بھابھی نے بھی چھوٹ دے رکھی ہے۔ یہ سوچے بنا کہ ابھی صرف ذکر چھیڑا ہے بات بنی نہیں ہے۔ چار دن گھومنے پھرنے اور موج مستی کرنے کے بعد وہ ٹکا سا جواب دے کر چلا گیا تو ہونہہ۔"

زہر اگلنے کے بعد وہ سر جھٹکتی ہوئی ام ہانی کو اسی حیرت کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا چھوڑ کے آگے بڑھ گئیں۔ ام ہانی ایک غوطہ کھا کے نکلی جھرجھری سی لی اور ان کے پیچھے لپکی۔

"پھوپھو... پھوپھو ایک منٹ۔" اور ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"کیسا جواب، پلیز کھل کے بتائیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ آپ... آپ کہہ کیا رہی ہیں؟"

"اوہو... اتنی ہی بھولی ہو ناں تم۔ اسی لیے آگے پیچھے گھوم رہی ہو اپنے اس کزن کے 'دل' لبھا رہی ہو اس کا کہ تمہاری خالہ نے رشتہ جو ڈال دیا ہے مگر لڑکی یہ ولایت پلٹ لڑکے ہیں ماں کے کہنے پر نہیں کرتے زندگی کے فیصلے' ہاں گھومنا پھرنا الگ بات..."

اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتی مہ پارہ یہ جا وہ جا۔

کتنی ہی دیر سکتے کے عالم میں کھڑے رہنے کے بعد ام ہانی ہوش میں آئی اور ان الجھے ہوئے طنز میں ڈوبے سوالوں کے جواب لینے نائلہ کے پاس پہنچی جو الگ الجھی ہوئی تھیں پہلے ہی سے۔

ایک تو سعد کا بے وقت بنا بتائے آجانا' پھر آتے ہی کمرے میں بند ہو جانا' اس پہ رضوان کا اس کی گوشمالی کے لیے اسے طلب کرنا اور پھر یہ گھرداری کے بکھیڑے' وہ رانی کے سر پر سوار اسے دوپہر کے کھانے

کے لیے ہدایت بھی دے رہی تھیں کہ ایک تو دلوا جی کو کھانا پورے ساڑھے بارہ بجے چاہیے ہوتا ہے' دوسرا مہمان بھی موجود تھا گھر میں مگر دھیان تھا کہ گول کمرے میں اٹکا تھا جہاں رضوان بے چینی سے چکر کاٹتے سعد کے انتظار میں تھے اور اوپر سے ام ہانی نے مزید انہیں حواس باختہ کردیا۔

"پلیز بتائیے ناں بڑی امی۔"

"ایک تو یہ مہ پارہ۔" پلاؤ کا بگھار بھونتے انہیں جی بھر کے نند پہ تاؤ آیا۔

"بہت جلدی ہوتی ہے اسے ہر کام کی اب بھلا کوئی تک ہے اس بے ڈھنگے انداز میں بتانے کی۔"

"مطلب۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ سچ کہہ رہی ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ میں بھی تمہیں آج رات بتانے ہی والی تھی مگر ذرا سلیقے سبھاؤ سے۔۔۔ ایسے نہیں کہ گھما کے سر پہ دے ماری بات۔"

لونگیں گن کے ڈالتے ہوئے وہ ناگواری سے کہنے لگیں جبکہ ام ہانی رونے والی ہو گئی۔

"مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ تو مگر کیوں؟"

نائلہ اب کیا کیا فکر پالتیں اس کے آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھیں دیکھتیں' مہ پارہ سے دو دو ہاتھ کرنے جاتیں یا سعد کی مدد کو پہنچتیں جو وہاں باپ کے سامنے سر جھکائے ان کا غضب سہہ رہا تھا یا پھر اس پلاؤ کے چونچلے اٹھاتیں آخر ممتا جیت گئی۔

"رضوان پتا نہیں کب سے سعد کی کلاس لے رہے ہیں' مجھے تو فکر ہو رہی ہے ارے بچہ ہے' دل گھبرا گیا ہو گا نئی جگہ پہ۔۔۔ آگیا۔۔۔ اب کیا اس پہ عدالت لگے گی؟ تم ذرا یہ پلاؤ دیکھنا میں ہو کے آؤں۔"

وہ چلی گئیں یہ دیکھے بغیر کہ ام ہانی ان کے پلاؤ کو دیکھنے کے لائق بھی ہے اس وقت یا نہیں۔

☼ ☼ ☼
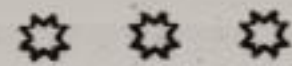
میں بے حس و حرکت سر جھکائے کھڑا تھا۔۔۔ ابو کی آواز چاروں جانب گونج ضرور رہی تھی مگر میری سماعتوں کو جھنجوڑنے میں ناکام تھی میں کچھ دیکھ رہا تھا تو صرف اس کے نام کے ساتھ لکھا کسی اور کا نام۔۔۔ میں کچھ سن رہا تھا تو اس کی وہ کھنکتی ہنسی جو میرے لیے نہیں کسی اور کے لیے تھی۔

"تمہیں کچھ عقل ہے یا نہیں؟ کب بڑے ہو گے۔۔۔ تیسرے ہی دن ہاسٹل سے منہ اٹھا کے گھر چلے آئے عجیب بچکانا پن ہے۔ میں کیا پوچھ رہا ہوں تم سے سعد؟ آخر تم نے پڑھنا ہے کہ نہیں؟"

"کیا ہو گیا ہے آپ کو رضوان؟"

امی کے مدد کے لیے پہنچنے پہ بھی میں نے نظر اٹھا کے دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

"ایک دن کے لیے گھر چلا بھی آیا تو ایسا کونسا فرق پڑ گیا پڑھائی پہ؟"

امی کی انگلیاں میرے ماتھے پہ پڑے بالوں کو محبت سے سلجھا رہی تھیں میں پھر بھی پتھر بنا رہا۔

"نائلہ تم خاموش رہو مجھے اس سے پوچھنے دو۔"

"مجھ سے پوچھیں۔۔۔ میں نے بلایا ہے اسے اب ماں کے کہنے پہ بھاگا آیا تو ڈانٹ بھی کھائے الٹا۔۔۔ واہ۔"

امی نے ہمیشہ کی طرح یہ بھی اپنے سر پہ لے لیا اور میں نے ایک بار بھی انہیں ممنون نظر سے نہ دیکھا۔

"تم نے؟ حد ہوتی ہے نائلہ تم اپنی ممتا کو کنٹرول میں رکھو ورنہ اکلوتا بیٹا نکما رہ جائے گا۔"

اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی میرے بے حد چاہنے والے امی ابو میں کوئی تلخی ہوئی کوئی چپقلش ہوئی گرما گرم بحث ہوئی تو وجہ میں ہی تھا۔

ان الفاظ میں کچھ تھا۔۔۔ جس نے میرے پتھر وجود میں اچانک دراڑیں ڈالیں اور میں سر اٹھا کے امی کو دیکھنے پہ مجبور ہو گیا۔

"آپ تو جانتے ہی ہیں وہ سعد سے ہی زیادہ قریب ہے' اس سے ہی دل کی بات کرتی ہے میں نے سوچا جنید کے بارے میں اس کی رائے اور مرضی میں سعد کے ذریعے ہی پوچھ لوں۔"

"رائے۔۔۔؟ مرضی؟"

میرے دل و دماغ میں یہ لفظ ٹن ٹن کرکے خطرے کی گھنٹی کی طرح بجنے لگے۔

"عورتیں بہت جلد باز ہوتی ہیں۔ تمہیں ابھی سے یہ فکر ہو گئی۔ ابو ابھی تک جھنجلا رہے تھے اور امی ان کی جھنجلاہٹ کے جواب میں جو وضاحتیں دے رہی تھیں ان سے میں جھنجلا رہا تھا۔

"جلد بازی کرنی پڑتی ہے رضوان۔ ہانی کی خالہ کا فون آیا تھا جنید نے بتا دیا ہے انہیں کہ اسے لڑکی پسند ہے ہم نے بھی تو اب کوئی جواب دینا ہے۔"

اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں نہ ہمت تھی' نہ ضرورت رہی تھی' اب میں تیزی سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے جانے لگا۔ ابو کے مزید خراب ہوتے مزاج کی پروا کیے بغیر' جواب میری شکایت لگا رہے تھے۔

"دیکھی تم نے اس کی بدتمیزی؟ پوچھے بغیر چلا گیا۔"

میرا رخ سیدھا کھنڈر کی جانب تھا اور میری توقع کے عین مطابق وہ وہاں مجھ سے پہلے موجود تھی۔ مگر جو وہ کر رہی تھی وہ ضرور خلاف توقع تھا ایک کوئلہ ہاتھ میں لیے وہ دیوار پہ لکھے اپنے اور جنید کے نام پہ سیاہی پھیر رہی تھی۔ میں چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی جس کی ہم نے توقع بھی نہیں کی ہوتی وہ ہو جائے یا ہو رہا ہو تو احساس ہوتا ہے کہ' توقع نہ کرنے کے باوجود ہمارے دل کے اندر کہیں اس کے ہو جانے کی خواہش کتنی شدید ہوتی ہے۔

ام ہانی ہاتھ جھاڑتی ہوئی مڑی۔

"بس؟ اب خوش اسی پہ ناراض تھے ناں؟ اس وجہ سے منہ پھلائے پھر رہے تھے کل سے۔"

"جب تمہیں پتا تھا میں ناراض ہو جاؤں گا تو ایسا کیا ہی کیوں؟"

"میں کیوں کروں گی؟ پاگل ہوں کیا؟ جنید نے لکھا تھا۔"

"یعنی وہ پاگل ہے؟" میں جل اٹھا۔

"میں نے منع کیا تھا اسے سعد۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ' تمہیں اس جگہ سے کتنی محبت ہے۔ ان دیواروں سے ان اینٹوں سے' اس کنویں سے' یہاں کے چپے چپے سے ہم نے کبھی یہاں پہ رینوویشن بھی نہیں ہونے دی تو تم کسی اور کا نام ان دیواروں پہ کیسے برداشت کر سکتے ہو۔"

وہ اتنے قریب آ کے اتنے نرم لہجے میں مجھے موم کر رہی تھی کہ میں پگھل گیا۔ موم نے پگھلنا ہی ہوتا ہے۔

"صرف دیواروں پہ؟" مگر میرے اس سوال کو شاید اس نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔

"اچھا... اب جانے دو غصہ یہ بتاؤ اچانک کیسے آئے؟"

"کیوں' رنگ میں بھنگ ڈال دیا میں نے؟"

موم پگھل بھی جائے تو کچھ دیر سلگ کے دھواں تو دیتا ہے۔ وہی دھواں میں اب تک اگل رہا تھا۔

"کس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ ایک تو تمہارا کچھ پتا نہیں چلتا کہ کب کس بات پہ ناراض ہو جاؤ اور مجھ سے تو تمہیں خاص دشمنی ہے کہ ذرا ذرا بات پہ نخرے دکھاتے ہو۔"

"تم سے دشمنی نہیں۔" میں چلتے چلتے رکا اور اپنی دھڑکنیں لمحہ بھر کو سمیٹ کر ہمت کر کے کہہ دیا ہے۔

"تم سے محبت ہے اور جن سے محبت ہو ان ہی سے ناراض بھی ہوتے ہیں۔"

کہنے کو تو کہہ ڈالا پھر بری طرح ڈر گیا بھلا یہ بھی کوئی یوں منہ پھاڑ کے کہنے والی بات تھی چلتے چلتے اور اس نے برا مان لیا تو؟ مگر نہیں وہ تو مسکرا دی تھی۔

"اچھا؟ اور یہ جو میں تمہارے پیچھے پیچھے تمہاری منتیں کرتی پھرتی ہوں تمہاری فضول بے کار ناراضیوں پہ تمہیں مناتی رہتی ہوں۔ یہ بھی میری محبت ہی ہے ورنہ اتنی پروا نہیں کی کبھی میں نے کسی کی۔"

"سچ...؟"

"اور نہیں تو کیا... بدھو۔"

وہ چہرے پہ آئی لٹ کو کان کے پیچھے کرتی... مندی کی باڑ پہ ہاتھ پھیرتی لاپروائی سے چلتی جا رہی تھی۔

"سنو... یہ کیوں آیا ہے؟" اس کی لاپروائی پل بھر کے لیے ڈگمگائی' تاکتے ہوئے کہنے لگی۔

"بس ایسے ہی گھومنے۔"

"جانتا ہوں میں اچھا؟ بتاؤ مت مجھے۔" مجھے پھر سے بگڑتا دیکھ کے وہ رکی اور ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

"مگر میں نہیں جانتی تھی یقین کرو ابھی پتا چلا۔"

"اس کی ہمت کیسے ہوئی' رکھ کے دو لگانی تھیں اسے۔" میرے پاس تو ہر بات کا ایک ہی حل تھا رکھ کے دو لگانا۔

"پاگل ہو تم۔ ایسا تھوڑا ہی کر سکتی تھی میں۔"

"میں لگاؤں جا کے؟ ابھی روتا روتا واپس بھاگے گا۔"

"خبردار جو کوئی فضول حرکت کی تو۔"

ام ہانی نے آنکھیں نکال کے مجھے رعب میں لینا چاہا۔

"کیوں؟ بہت اچھا لگ رہا ہے کیا شادی کرلوگی اس سے؟" مجھے خود بھی محسوس ہو رہا تھا کہ میری زبان سے الفاظ نہیں۔ انگارے نکل رہے ہوں۔

"نہیں کرنا چاہتی' مگر کروں گی یا نہیں یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ سعد مجھ سے میری مرضی کون پوچھ رہا ہے۔"

اس کی بے بسی مجھ سے دیکھی نہ گئی... میں اس کے ہاتھ تھام کے بے ساختہ کہہ اٹھا۔

"میرے لیے بہت اہم ہے تمہاری مرضی میں پوچھ رہا ہوں۔"

"تمہیں بتانے کی ضرورت ہے کیا' تم نہیں جانتے؟"

چند لمحے خاموشی سے مجھے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے وہ سوال کیا جو میرے اندر کئی کھڑکیاں کھول گیا۔

"میں یہاں سے نہیں جانا چاہتی سعد... بالکل بھی نہیں۔" اور ان کھلی کھڑکیوں سے آتی تازہ ہوا نے مجھے اندر تک ٹھنڈا کر دیا۔

"اور تم یہاں سے کبھی کہیں جاؤ گی بھی نہیں' میں جانے ہی نہیں دوں گا۔ دیکھ لوں گا سب کو۔"

اس کے ہاتھ دبا کے میں نے یقین دلایا۔

☼ ☼ ☼
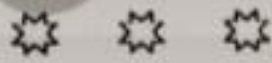
امی نے ابو کو نجانے کون سی تسلیاں دی تھیں کہ' اب ان کا موڈ قدرے بہتر تھا اور وہ کھانے کے دوران مجھ پہ شعلے برساتی نظروں سے دیکھنے سے گریز کر رہے تھے لیکن میں جانتا تھا یہ وقتی ہے۔ جو کرنے کی میں نے ٹھان لی تھی۔ اس کے بعد یہ شعلے صرف نگاہوں سے نہیں برسنے تھے۔

"ام ہانی میری خواہش تو یہ تھی کہ تمہاری گریجویشن مکمل ہوتے ہی تمہارے فرض سے آزاد ہو جاتی' مگر تمہارا انجینئرنگ کا شوق خیر اب تو ایک سال میں تم نے یہ شوق بھی پورا کر لیا۔"

امی کی تمہید سے ام ہانی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کیا ذکر چھڑنے والا ہے وہ بے چین نظر آنے لگی۔

"اور ہمارے نہ سہی تمہارے تو خاندان کا ہے۔ تمہاری سگی خالہ ہیں وہ میرے اطمینان کے لیے اتنا کافی ہے۔"

ابو نے اضافہ کیا میں نے ہاتھ میں پکڑا چمچہ واپس پلیٹ میں رکھ کے سب کے چہروں پہ ایک گہری نظر ڈالی۔

"میں خود بہت مطمئن ہوں اچھا لڑکا ہے شریف خوش مزاج' خوبرو اور سب سے بڑھ کے اپنا۔" امی کی بات پہ میں نے پلیٹ پرے کھسکائی۔

"مگر میں مطمئن نہیں ہوں۔" ایک لمحے کے لیے تو سب حیران رہ گئے۔ لاتعلقی سے کباب چٹنی میں بھگو بھگو کے کھاتی مہ پارہ پھوپھو بھی۔

"تمہارا مطمئن ہونا... یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا سعد' یہ ام ہانی کا معاملہ ہے اور ہم اسی سے بات کر رہے ہیں۔" ابو پرانے موڈ میں آنے لگے۔

"بالکل یہ ام ہانی کا معاملہ ہے اس کی زندگی کا آپ ایسے یکطرفہ فیصلے کیسے کر سکتے ہیں۔"

پھوپھو نے بڑی جتاتی ہوئی سی نظر امی پہ ڈالی جس کا مفہوم بھانپ کے وہ بھی جز بز ہو گئیں۔

"ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہم ام ہانی سے ڈسکس کر رہے ہیں۔"

"نہیں امی آپ اسے بتا رہی ہیں کہ 'آپ سب کی یہی مرضی ہے اور اسے ہر حال میں جواب ہاں میں دینا ہے۔"

"سعد خاموش اب تم حد سے بڑھ رہے ہو۔"

ابو کھڑے ہو گئے میں نے بھی نشست چھوڑ دی ام ہانی دم سادھے ہراساں نظروں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ حد پار کر نہیں رہا بھائی جان۔ اس سے کروائی جا رہی ہے۔" پھوپھو نے ام ہانی کو گھور کے کہا اس کا رنگ مزید فق کیا۔

"میں آپ سے صاف کہہ رہا ہوں۔ یہ خیال دل سے نکال دیں کہ آپ لوگ اپنی مرضی سے جو فیصلہ کریں گے۔ ہنی کو اسے ماننا ہو گا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

وارننگ دیتا میں وہاں سے نکل گیا۔ یہ دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ اب وہاں اس بات کو کیا کیا رنگ

دبیے جائیں گے۔ ماحول کو مزید بھڑکانے میں مہ پارہ پھوپھو پیش پیش تھیں۔

"کیا غلط کر دیا ہم نے؟ کیا یہ لڑکی ہماری ذمے داری نہیں؟ اور کیا اس کے ماں باپ زندہ ہوتے تو اس کے لیے یہ فیصلہ خود نہ لیتے؟ مگر اس لڑکی نے تو ہمیں کبھی کچھ سمجھا ہی نہیں۔ اتنی خود مختاری اور خود سری؟"

"مہ پارہ۔۔۔ تم ہانی پہ کیوں بگڑ رہی ہو۔ اس نے تو کچھ نہیں کہا یہ تو سعد ہی دن بدن۔۔۔"

"بھائی جان تو آپ کا خیال ہے سعد یہ سب بدتمیزی بلاوجہ کر کے گیا ہے؟ اس نے ہمیشہ کی طرح سعد کے کاندھے پہ رکھ کے بندوق چلائی ہے۔ ذرا سے بچے کو اس کے ماں باپ کے مقابلے پہ تن کے کھڑا کر دیا اور اب خود معصوم بنی بیٹھی ہے۔"

ام ہانی کے آنسو ٹپ ٹپ کر کے اس کی گود میں رکھے ہاتھوں پہ گر رہے تھے۔

"اور بھابھی آپ کیوں رو رہی ہیں اب؟ میں تو ہمیشہ سے کہتی آئی ہوں نہ موقع دیں اسے سعد کو ہتھیار بنانے کا۔" ان کے بھڑکانے پہ وہ اور بھی شدت سے رو دیں۔

"تم نے ہمیشہ اپنے اور میرے درمیان فاصلے رکھے ہانی۔ تم آئیں تو مجھے لگا میری زندگی میں بیٹی کی کمی پوری ہو جائے گی۔ مگر تم نے مجھے ماں تو کیا کچھ بھی نہ سمجھا۔ کچھ نہیں کہا، کچھ نہیں مانگا، کوئی فرمائش، کوئی ضرورت، کوئی شکایت، کچھ بھی نہیں۔"

"نائلہ تم بات کو کس طرف لے کر جا رہی ہو۔"

"اب بھی یہی ہوا ہے رضوان، اگر اسے اس رشتے پہ کوئی اعتراض تھا تو بیٹی بن کے مجھ سے کہتی مجھ پہ اعتبار کرتی۔ لیکن اس نے سعد کے ذریعے بات پہنچائی۔"

ام ہانی کے دل کو ان آنسوؤں بھرے مان بھرے گلے سے بڑی ٹھیس پہنچی وہ اٹھ کے ان کی جانب آگئی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"ایسا کچھ نہیں ہے تائی اماں۔۔۔ میں نے کبھی کوئی فاصلہ نہیں رکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ فرمائش یا شکایت کی نوبت ہی نہیں آنے دی آپ نے کبھی، میری ہر ضرورت ماں کی طرح بن کہے پوری کی اور میں سچ کہہ رہی ہوں میں نے سعد سے بالکل نہیں کہا کہ وہ آپ سے یہ بات کرے۔ ہاں میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی کیونکہ میں اس ملک سے باہر نہیں جانا چاہتی تھی، جہاں میرے اماں ابا کی یادیں ہیں۔ بس آپ سے کہنے میں جھجک رہی تھی۔"

محبت سے کہتے اس نے ان کی گود میں سر رکھ دیا تو وہ پسیج گئیں اور اسی محبت سے جھک کے اس کا ماتھا چوم لیا جو مہ پارہ کو مزید سلگانے کے لیے کافی تھا۔

"تو سعد سے دکھڑا تو رویا ہو گا جو وہ اتنی سرکشی دکھا کے گیا ہے جیسے وہی تمہاری والی وارث ہو۔"

"مہ پارہ بات کو بڑھاؤ مت۔ سعد عمر کے اس حصے میں ہے جہاں اپنے بڑے ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ وہ گھر کے اہم معاملات میں دخل دے کر ہمیں اپنے ہونے کا احساس دلا رہا ہے اور بس۔۔۔"

"رضوان ٹھیک کہہ رہے ہیں اور پھر وہ ہانی سے اٹیچ بھی بہت ہے اس کے اتنے دور جانے کے خیال سے جذباتی ہو گیا ہو گا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ اس کی ضد کی خاطر اسے بھی بٹھائے رکھیں حویلی میں، ایک سے بھلی دو۔"

اور اسی ساری بحث اور ہنگامے سے دور میں جنید کا ہاتھ تھامے اسے گھسیٹتے ہوئے کھنڈر کی جانب لے جا رہا تھا۔ وہ حیران پریشان، ناگواری سے خود کو چھڑاتا پوچھتا جا رہا تھا۔

"سنو! کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔"

اور گھسٹتا جا رہا تھا۔۔۔ گھسٹتا جا رہا تھا اور پوچھتا جا رہا تھا۔

"مجھے کچھ نہیں پتا آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔"

میں نے سیدھا اسے وہیں لا کے کھڑا کیا، جہاں اس نے ام ہانی کے نام کے ساتھ اپنا نام لکھنے کی جسارت کی تھی۔ اب وہاں پھیلی ہوئی سیاہی کے علاوہ کچھ نہیں تھا جس پہ نظر پڑتے ہی وہ چپ ہو گیا۔

"تمہیں جواب چاہیے تھا ناں... یہ ہے جواب۔"

"یہ کیا حرکت ہے۔ تمہارا یہ بچکانا رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔" اس کی بات پہ میں طنز سے مسکرایا۔

"تمہیں لگتا ہے یہ حرکت میں نے کی ہے... جا کے دیکھو جنید کوئلے کی یہ سیاہی اتنی گہری ہوتی ہے کہ دھونے کے باوجود ابھی تک ہنی کے ہاتھوں سے گئی نہیں ہوگی۔"

"اوہ۔"

سمجھ دار تھا سمجھ گیا وہ بھی جو میں نے بتایا' وہ بھی جو میں نے نہیں بتایا... میں نہیں جانتا اس نے اپنی ماں کو... ہنی کی خالہ کو کیا کہہ کر مطمئن کیا بس اتنا پتا ہے کہ اگلے دو گھنٹوں کے اندر اندر وہ یہاں سے چلا گیا اور تیسرے گھنٹے میں اس کی ماما نے بڑے شرمسار انداز میں فون پہ ماما سے معذرت کرلی۔

☼ ☼ ☼

وہ گیلے بالوں کے ساتھ برآمدے میں بچھے تخت پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ شام کے سائے گہرے ہوتے ہی خنکی بڑھ جاتی ہے تو اس نے شال بھی اوڑھ رکھی تھی۔ میں ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتا وہیں رک گیا۔

بس اتنی سی بات تھی... صرف تین گھنٹے... تین گھنٹوں کے اندر اندر میں اپنے اور اس کے درمیان آنے والے کسی بھی شخص کو بھگا سکتا ہوں۔

"سچ سچ بتاؤ سعد تم نے کیا کہا تھا اسے کہ وہ یوں چلا گیا۔" مجھ پہ نظر پڑتے ہی وہ پوچھنے لگی۔

"لاحول پڑھی تھی میں نے صرف۔" میں اس کے ساتھ ہی تخت پہ نیم دراز ہوگیا۔

"سعد' وہ مہمان تھا۔"

اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے میں نے اس کی شال کا کونا گھسیٹا۔

"ادھر دو مجھے بھی... سردی لگ رہی ہے۔"

"تو اندر چلے جاؤ ناں... سردی لگ رہی ہے تو۔"

"نہیں... میں نے تخت پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے بالوں کی مہکی مہکی ٹھنڈک مجھ پہ غنودگی طاری کر رہی تھی۔

"سعد تم کیوں کرتے ہو ایسا... سب پریشان ہوتے ہیں اور پھوپھو کو لگتا ہے میں تمہیں بگاڑ رہی ہوں۔"

میں نے نیند سے بوجھل آنکھیں ذرا سی کھول کے اسے دیکھا... شام کے اس پہر وہ کتنی سرمئی سی لگ رہی تھی۔

"تمہارے بالوں کی خوشبو سے مجھے نیند کیوں آتی ہے؟"

"میں کیا کہہ رہی ہوں تم سے اور تم..."

"کیا میں ہمیشہ تمہاری شال میں سو سکتا ہوں؟"

"اف بدھو۔"

"اچھا... بس آج۔"

نیند میں ڈوبنے سے پہلے بس اس کی مسکراہٹ دیکھی تھی میں نے اور کانوں میں گونجی دور سے آتی بانسری کی دھن۔

☼ ☼ ☼

میرا کام پورا ہو گیا تھا ابو کا اگلا لیکچر میں نے ایک پرسکون اور ڈھیٹ سی مسکراہٹ کے ساتھ سنا اور واپس ہاسٹل چلا آیا۔

"یعنی تمہاری چھٹی حس نے تمہیں بالکل صحیح سگنل دیا تھا اور تم وقت پہ پہنچ گئے تھے۔"

شعیب نے رات کے کھانے کے بعد مال روڈ پہ میرے ساتھ ٹہلتے ہوئے ہنس کے کہا تھا۔

"اس کے بارے میں میرا دل کبھی غلط سگنل دے ہی نہیں سکتا۔"

"اس بار تو نیا ڈوبنے سے بچالی بیٹا۔ ہر بار ایسا نہیں ہوگا۔ تم اسے بتا کیوں نہیں دیتے؟"

"اسے پتا ہے۔" میرے اطمینان کا وہی عالم تھا۔

"مجھے یہ ہی پتا ہے کہ وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ جتنا میں اسے چاہتا ہوں اس سے بھی زیادہ۔"

"تو رکاوٹ کیا ہے یار... بات کرو گھر میں قصہ ختم کر

"ریکلوٹ ہے ناں یار... میری عمر... ابھی انیس کا ہوں... ابھی یہ بات کی ناں تو ابو کے لیکچرز کو ایک نیا رخ مل جائے گا... مگر یار وقت گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ پتا ہی نہیں چلے گا اور ایک کے بعد دوسرا سال گزرے گا۔ دوسرے کے بعد تیسرا۔ ایکس 'بائیس کا ہو جاؤں گا۔ ایجوکیشن بھی کمپلیٹ ہو جائے تو امی سے کہہ دوں گا کہ ہنی سے میری شادی کروا دیں سمپل۔"

میں ساری پلاننگ اسے بتا رہا تھا اور وہ محظوظ ہونے والی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ رہا تھا۔

"اور کیا میں نے سب سوچ رکھا ہے۔"

"زندگی کو سوچنا بہت آسان ہے سعد... اور سوچ ہی سوچ میں زندگی بھی بہت آسان لگتی ہے لیکن میرے دوست... زندگی کو دھوبی پٹخا دینا بڑا زبردست آتا ہے۔"

"دھوبی پٹخا؟"

"ہاں... زندگی کو پسند ہے... سرپرائز دینا اور کبھی کبھی شاک دینا سوبی پریپیرڈ۔"

اور دور کہیں زندگی مجھے سرپرائز بلکہ شاک دینے کے لیے تیاریاں کر رہی تھی۔

✡ ✡ ✡
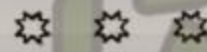
پیپل کا وہ درخت اس سرکاری دفتر کے سال خوردہ پلستر جھڑی عمارت کے سامنے ذرا سے فاصلے پہ تھا... جس کی گھنی شاخیں دور تک پھیلی نیچے کو جھک آئی تھیں۔ اور اسی ایک تنومند سی شاخ پہ ہلکے بادامی کرتا پاجامے میں ام ہانی اپنی اسکیچ بک پہ پنسل پھیرنے میں مصروف تھی۔

گاہے گاہے نظر اٹھا کے اس عمارت کو دیکھتی۔ جو گزشتہ کئی سالوں سے ویران پڑی تھی۔ اس کے عکس کو ورق پہ اتارتے ہوئے وہ اتنی مگن تھی کہ اپنے آسمانی دوپٹے تک کو سنبھالنے کا ہوش نہ تھا جو ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ فضا میں ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ تھی۔

یا کورے کاغذ پہ پنسل کی... یا پھر پنسل کو تھامے ہاتھ کی حرکت سے گنگنا اٹھنے والی کانچ کی چوڑیوں کی اور پھر ایک اور آواز... کسی گاڑی کے زور سے بجتے ہارن کی کرخت آواز... جس پہ ام ہانی کا انہماک ٹوٹا۔

ایک ہاتھ سے اڑتے دوپٹے کو سنبھالتے اس نے بے زاری بھری نظر سامنے ڈالی... اسی عمارت کے سامنے رکی سرکاری نمبر پلیٹ والی گاڑی سے سالار اعظم دو تین لوگوں کے ہمراہ اتر رہا تھا۔

ام ہانی کی نظروں کی بے زاری جانے کیسے پل بھر میں معدوم ہو گئی۔ ہاتھ سے آنچل پھر سے چھوٹ گیا۔

✡ ✡ ✡

"تم مجھے کس بات سے ڈرانا چاہ رہے ہو آخر؟"

رات سے شعیب نے مجھے پکا ڈالا تھا آخر صبح ناشتا کرتے ہوئے میں پھٹ پڑا اور باقاعدہ اس پہ کانٹا تان لیا۔

"ڈرا نہیں رہا تمہاری بے فکری ختم کرنا چاہ رہا ہوں۔" شعیب نے میرے ہاتھ سے کانٹا چھینا اور تربوز کی قاش میں گھونپ دیا۔

"وہ کزن ہے میری... ہم ایک گھر میں رہتے ہیں۔ میری امی بھی اسے بہت پسند کرتی ہیں اور ابو بھی بہت چاہتے ہیں' کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا دیکھ لینا جب مناسب وقت آئے گا اور میں یہ بات کروں گا تو سب ہنسی خوشی راضی ہو جائیں گے۔"

"لیکن اگر اس سے پہلے کسی اور کا مناسب وقت آگیا تو؟"

شعیب کی بات پہ توس پہ جیم لگاتے لگاتے میں ٹھٹک گیا۔

"کسی اور کا؟ کون؟"

"کوئی بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے میرے ہاتھ سے توس لے کر خود کھانا شروع کر دیا۔

"میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ کم از کم جسے چاہتے ہو اسے تو دل کی بات کہہ دو۔ ایسا نہ ہو تمہارے مناسب وقت کے انتظار میں کوئی اور تم دونوں کے

درمیان آجائے۔"

مجھے اس بے تکی بات پہ شعیب پہ تاؤ آنا چاہیے تھا۔ مگر مجھے ہنسی آگئی۔

"درمیان میں دو لوگوں کے آیا جاتا ہے۔ ہم دو نہیں ہیں ام ہانی اور میں ایک ہیں اور ایک کے درمیان کوئی نہیں آتا۔"

☆ ☆ ☆
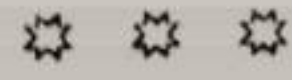
وہ پنسل لبوں میں دبائے یک ٹک اس اجنبی کو دیکھے چلی جارہی تھی۔ جس کا بنا کریز کا گرے تھری پیس سوٹ چم چم کرتے سیاہ جوتے اور سلیقے سے ترشے بال اس کی نفاست پسندی کا ثبوت دے رہے تھے اور وہ فون کان سے لگائے اسی عمارت کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اور پیچھے چلتے دو تین لوگ کسی کے ہاتھ میں لیپ ٹاپ تو کسی کے ہاتھ میں فائلیں تھیں وہ اس وقت اچانک رکے۔ جب سالار اعظم فون جیب میں رکھتا ہوا مڑا.... اور پھر عمارت کے گیٹ اور جالے لگی زنگ آلود سلاخوں والی کھڑکیوں کی جانب اشارے کرتا ان سے کچھ کہنے لگا۔

وہ ایک سحر کے عالم سے نکلی۔ لبوں میں دبی پنسل نکالی۔ سرعت سے اسکیچ بک کا ورق الٹا اور اگلے کورے صفحے پہ ایک اور نقش کھینچنے لگی.... سالار اعظم کا۔

ایک ہڑک سی اٹھی تھی اس کے اندر.... اس کا خاکہ تراشنے کی اس کے ایک ایک نقش کو محفوظ کرنے کی کیوں؟ یہ وہ بھی نہیں جانتی تھی بس اس کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں تھا اور نظر اٹھا کے وہ بار بار سامنے دیکھ لیتی تھی اور پانچویں بار جب نظر اٹھی۔ تو وہ نظر کی حدود میں نہیں تھا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے اس کے تینوں ساتھی ضرور نظر آرہے تھے۔ جس کا مطلب تھا وہ ان سے پہلے اندر جاچکا تھا۔

ام ہانی نے ایک پریشان سی نظر ادھورے اسکیچ پہ ڈالی۔ ادھورا ابھی کہاں تھا ابھی.... مایوسی اس کے چہرے کی موتیا سی رنگت کو پھیکا کرنے لگی.... مگر وہ ہڑک.... وہ اس کا خاکہ ان اوراق میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلینے کی عجیب و غریب مگر شدید قسم کی خواہش.... اس نے ام ہانی کو چین سے وہاں بیٹھنے نہیں دیا جیسے وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کب اور کیسے وہ اس کا اسکیچ بنانے پہ مجبور ہوگئی۔ ایسے ہی اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ کب وہ درخت سے نیچے اتری کب اس پرانی عمارت کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور کب اس ٹوٹے شیشے والی کھڑکی سے اندر ہال میں جھانکنے لگی۔

سالار اعظم چاروں جانب جائزہ لیتے ہوئے اپنے ساتھیوں' جو شاید اس کے ماتحت بھی تھے انہیں مختلف قسم کی ہدایات دے رہا تھا۔ ام ہانی نے چپکے سے کاپی دوبارہ کھولی۔ دیوار سے چپکائی اور اس کی پنسل تیزی سے ان نامکمل نقوش کے خطوط کو بھرنے لگی۔

"یہ سب مکمل طور پر چینج ہوگا کتنے دن لگیں گے اس میں اندازا"؟"

بات کرتے کرتے اس نے رخ اپنے ماتحت کی جانب موڑ لیا جو لیپ ٹاپ پہ اسے کچھ دکھا رہا تھا اب ام ہانی کو کوفت ہونے لگی۔ کب وہ دوبارہ رخ اس جانب کرے گا۔

"اور وہ سامنے والی بلڈنگ.... وہ کیا ہے؟"

اب وہ دائیں جانب کھلنے والی کھڑکی سے باہر اشارہ کررہا تھا۔ ام ہانی کی پنسل پھر سے حرکت میں آئی۔

"لائبریری ہے سر۔"

"اور وہ دور.... ریل کی پٹڑی کے پار۔"

وہ آگے بڑھ گیا.... پھر سے اس کی نظر کی حدود کے پرے۔

ام ہانی سرعت سے کاپی پنسل اٹھائے چند منٹ کے فاصلے پہ موجود دوسری کھڑکی کے سامنے تھی.... جہاں سے اب وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ واضح نظر آرہا تھا۔

"جنرل رضا کا نمبر ملانا شاہد۔"

اپنے ماتحت سے کہتے ہوئے اچانک سالار اعظم کو کسی کی نظروں کی تپش کا احساس بہت شدت سے ہوا.... وہ چونکا اور چوکنا ہوکے اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ام ہانی کی جیسے جان ہی نکل گئی وہ پھرتی سے کھڑکی سے پرے ہٹی اور دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑی

ہو گئی۔

کہیں کسی کو نہ پا کے سالار نے سر جھٹک کے اس بے معنی وہم کو دور کرنا چاہا اور ہاتھ بڑھا کے اپنے ماتحت سے فون تھاما۔

"Hello saalar here"

اور بات کرتے ہوئے کھڑکی کے پار ایک آسمانی آنچل کی جھلک نے اسے دوبارہ بری طرح چونکنے پہ مجبور کیا۔

ام ہانی دیوار سے چپکی دم سادھے کھڑی تھی۔

"پتا نہیں اس نے مجھے دیکھا یا نہیں؟ نہیں نہیں نہیں دیکھا ہو گا۔"

خود کو تسلی دیتے ہوئے اس نے ڈرتے ڈرتے پھر سے اندر جھانکنا چاہا۔۔۔ وہ اب وہاں نہیں تھا۔۔۔ کہیں بھی نہیں اس کے ماتحت کوئی چارٹ پیپر پھیلائے اس پہ جھکے مارکر سے کچھ لکیریں کھینچنے میں مصروف تھے۔

ایک اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے وہ دوبارہ سیدھی ہوئی تو وہی اطمینان بھرا سانس سینے میں اٹک کے رہ گیا۔ وہ اس کے بالکل سامنے دو ہاتھ کے فاصلے پہ کھڑا اسے گہری نظروں سے گھور رہا تھا۔ خشک ہوتے حلق کو تر کرتے ہوئے ام ہانی نے ہاتھوں میں دبی اسکیچ بک کو اس کی نظروں کی زد میں آنے سے بچانے کے لیے اپنے پیچھے چھپانا چاہا۔ مگر اسی وقت سالار نے جھپٹ کے اسکیچ بک اس سے چھین لی۔

ام ہانی کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔۔۔ وہ ماتھے پہ ناگواری سے بل ڈالے اس کے ورق پلٹ رہا تھا اور ام ہانی فرار کی راہ تلاش رہی تھی وہ اپنے چھ فٹ کے وجود کے ساتھ اس کے اتنے قریب کھڑا تھا کہ وہ بھاگنے کی کوشش بھی کرتی تو اس سے ٹکرا جاتی۔

"کس کی اجازت سے بنایا ہے یہ تم نے؟"

اب سالار کی نظریں اس ادھورے سے اسکیچ پہ جم گئیں جو اتنا بھی ادھورا نہیں رہا تھا کہ وہ خود کو پہچان نہ پاتا اور پھر ام ہانی کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے اسکیچ بک کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے پھاڑ ڈالا۔ شاید اس کے ہولے ہولے کپکپاتے وجود اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے یہ امید ہی نہیں رہی تھی کہ وہ کبھی کچھ بتا بھی سکے گی۔۔۔ مگر اپنی جان سے عزیز اسکیچ بک جس میں اس کے کئی محنت سے بنائے خاکے تھے۔ اسے دو حصوں میں ہوتا دیکھ کے وہ بول ہی اٹھی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ اس میں میری اتنی محنت سے بنائی۔۔۔"

لیکن اس سے آگے اس کی گویائی پھر سے سلب ہو گئی۔ کیونکہ سالار نے اس کے مزید پرزے کرنے کی نیت سے اسے پھر سے دونوں ہاتھوں میں تھاما تھا۔ ام ہانی کی آنکھوں میں بے بسی سے آنسو آ گئے۔۔۔ یہ موٹے موٹے آنسو۔

اور سالار جو بے حد طیش کے عالم میں اس کے چہرے کے سامنے اسکیچ بک کے یہ دونوں حصے کئی حصوں میں تقسیم کرنے کی نیت سے آگے کیے ہوا تھا۔ وہیں رک گیا۔ اسے اب اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوائے ان آنسوؤں کے، وہ گھبرا کے دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔ جیسے گہرے کنویں میں جھانکنے کے بعد کوئی سٹ پٹا کے پرے ہٹتا ہے کہ اس میں گر کے ڈوب ہی نہ جائے۔

اس کے کچھ دور ہوتے ہی ام ہانی نے بھاگنے کی راہ لی۔۔۔ اور وہ ہاتھ میں اسکیچ بک کے دونوں حصے تھامے گم صم کھڑا دور تک اسے بھاگتے دیکھتا رہا۔

☼ ☼ ☼

"پھر سے تم دوا لینے کے بہانے سارا دن گھر سے باہر رہی ہو۔" سلمیٰ سر جھکائے کھڑی نائلہ کی ڈانٹ سن رہی تھی اور مہ پارہ کو تو اب بھی نائلہ کے الفاظ کم لگ رہے تھے۔ وہ اپنی زبان زہر میں بھگو کے میدان میں اتریں۔

"دوہتی کٹی تو ہو۔ دوا کس چیز کی لینے جاتی ہو سر میں درد ہے؟ بخار ہے؟ گلا خراب ہے؟ پھوٹ منہ سے گھر میں ہر طرح کی دوا رکھی ہے دادا جی کا کمرہ نہ ہوا۔ پنساری کی دوکان ہوئی۔۔۔ کیا نہیں رکھا اس میں۔"

"اور زیادہ طبیعت خراب تھی تو میں خود کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھالاتی۔ یوں نیم حکیموں کے پاس جا کے کوئی نیا روگ نہ لگوا بیٹھنا۔"

نائلہ نے شاید مہ پارہ کے زہریلے الفاظ کی سنگینی زائل کرنے کے لیے اسے پچکارا تھا ورنہ تاؤ تو انہیں بھی بہت تھا اس کے سارا دن غائب رہنے پہ۔

"میں بیگم صاحبہ... مجھے ڈاکٹر کی دوا راس نہیں آتی گرم بہت ہوتی ہے مجھے تو اسی حکیم کی دوا سے افاقہ ہوتا ہے ہمارا خاندانی حکیم ہے۔"

"لو... اللہ کی... شان 'خاندان کا اتا پتا کوئی نہیں اور خاندانی حکیم رکھ چھوڑا..."

مہ پارہ کے تو چنگاریاں ہی سلگ اٹھیں۔

"جھوٹی لپاڑن... چھ برس کی عمر سے تو یہاں ہے ماں باپ کی شکل یاد نہ ہوگی تجھے۔ حکیم یاد رہ گیا؟"

"بس بھی کرو مہ پارہ... سلمیٰ تم جاؤ کچن میں۔"

نائلہ کو اس تماشے سے اب گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

وہ مزاجا" ذرا نرم خو تھیں۔

"کیوں ملازموں کے منہ لگتی ہو مہ پارہ۔" سلمیٰ کے جان بچا کے کھسکنے پہ انہوں نے نند کو بھی سمجھانا چاہا۔

"حویلی کی ملازمائیں ہی ہماری ذمے داری ہیں بھابھی۔ ان کی ایسی ویسی حرکتوں سے ہماری ہی عزت پہ حرف آسکتا ہے۔ چال دیکھی تھی آپ نے اس کی... کیسے مٹک مٹک کے چلتی ہے۔"

"مجھے احساس ہے اس ذمے داری کا۔ اسی لیے تو میں نے رضوان سے کہہ دیا ہے کہ اپنے ڈرائیور سے نکاح پڑھادیں سلمیٰ کا۔"

اور آدھے راستے سے کچھ پوچھنے کے لیے پلٹ کے آتی سلمیٰ وہیں جم کے رہ گئی۔

"نکاح؟" مہ پارہ کا چہرہ تاریک سا ہوگیا۔

"ہاں اٹھارویں میں لگی ہے۔ بارود کا ڈھیر... جتنی جلدی ٹھکانے لگے اتنا اچھا۔"

سلمیٰ مرے مرے قدموں سے واپس پلٹ گئی۔ ام ہانی نے اسے بالوں میں تیل لگوانے کے لیے بلایا تھا۔

بے دھیانی میں اس نے سنگھار میز سے آملے کے تیل کی بجائے ہاتھوں پہ لگانے والا لوشن اٹھالیا۔ وہ تو شکر ہے کہ ہتھیلی پہ ڈالتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا' بالوں میں نہ لگا بیٹھی جلدی سے ہتھیلی بازو پہ رگڑ کے صاف کی اور تیل کی شیشی اٹھاتے ہوئے ام ہانی کو دیکھا کہ اب ایک اور ڈانٹ پڑے گی مگر ام ہانی تو شاید اس سے بھی کہیں بڑھ کے بے دھیانی کے عالم میں تھی کھوئی کھوئی نظروں سے کھڑکی کے پار دیکھتی کچھ سوچتی کچھ جاگتی اور کچھ اونگھتی۔

سلمیٰ نے اس کے گہرے بھورے بالوں کی چٹیا کے بل کھولنے شروع ہی کیے تھے کہ کھڑکی سے ہوا کے دوش پہ آتی بانسری کی لے نے اس کے ہاتھ روک دیے... ام ہانی بھی جیسے کسی خیال سے چونکی تھی۔

"پتا نہیں... یہ بانسری کون بجاتا ہے؟"

ہمیشہ ہی وہ اس بانسری کی آواز پہ یہ سوال کرتی تھی اور ہمیشہ ہی سلمیٰ چور سی بن کے کسی کام میں لگ جاتی تھی... مگر آج اس کا جی چاہ رہا تھا ہانی بی بی یہی سوال بار بار کرتی جائیں... یہاں تک کہ وہ جواب دینے پر مجبور ہو جائے۔

"روز ہی اس وقت سر بکھرتے ہیں۔"

"آج سر کہاں ہیں ہانی بی بی آج تو درد بکھر رہے ہیں۔ بانسری کرلا رہی ہے۔" ہانی نے مڑ کے اسے دیکھا۔ بنا کچھ پوچھے... بنا اس کے کچھ بتائے وہ سب جان گئی۔

"کون ہے یہ سلمیٰ؟"

"ہے نہیں تھا..." اس نے آہ بھری۔

"مگر تم آج بھی اس سے ملنے گئی تھی نا' میں جانتی ہوں۔"

"ہے کو تھا ہونے میں کونسا وقت لگتا ہے ہانی بی بی... جب اس سے ملنے گئی تھی تو آنکھوں میں خواب اور دل میں بہت سی خواہشیں تھیں واپس آئی تو مالکوں نے ایک جھٹکے میں سب خواب نوچ ڈالے... ساری خواہشیں دل کے اندر ہی ماردیں... کیا کر سکتے ہیں ہم ان کے آگے... مختار ہیں وہ ہمارے۔"

وہ سہ رنگی چنری سے آنکھیں رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگی۔ جن کا کاجل آنسوؤں سے پھیل کے اس کے پھولے پھولے سانولے رخساروں تک آرہا تھا۔

"دل کا مختار کوئی نہیں ہوتا سلمی... اس پہ تو کبھی کبھی اپنا اختیار بھی نہیں ہوتا... کسی اور کا کیا ہوگا۔"

ام ہانی نے اپنا سر سلمی کے گھٹنوں سے ٹیک دیا اور آنکھیں موندے بانسری کے سروں میں کھونے لگی جو واقعی کرلا رہی تھی آج۔

☼ ☼ ☼
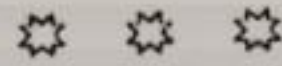
پتا نہیں کیوں مجھے ساری رات نیند نہیں آئی... بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا کچھ تھا۔ جو چھن رہا تھا 'کچھ تھا جو میں کھونے لگا تھا اور میرے پاس کھونے کے لیے اس کے سوا اور تھا ہی کیا' بے چینی ایک بے نام سے خوف میں ڈھل گئی اور میں نے صبح ہوتے ہی اسے فون کر ڈالا۔

"کچھ خاص نہیں اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہی ہوں۔" اس کے بتانے پہ رات والی بے چینی اور اضطراب پھر سے عود کر آیا... وہی کچھ چھن جانے' لٹ جانے اور کھو جانے کا خوف۔

"ہنی تم کہیں مت جایا کرو۔" میں بے تابی سے کہہ اٹھا۔

"ارے وہ کیوں؟"

"بس... ایسے ہی۔" مجھ سے جواب نہ بن پایا۔

"بدھو گھر پہ رہ کے کیا کروں سارا دن؟" وہ کھلکھلا اٹھی۔

"کچھ بھی... پینٹنگ کرلیا کرو... اسکیچ بنالیا لو... مگر یہیں گھر میں' باہر مت نکلا کرو تم۔"

"عجیب پاگل ہو تم یہ کیا ضد ہوئی بھلا... اور تمہیں تو پتا ہے میں وہی چیز' وہی منظر پینٹ کرتی ہوں' جو میری آنکھوں کو اچھی لگے... دل کو بھائے' گھر میں کیا اپنے ہی کمرے کی تصویریں بناتی رہا کروں۔ ہزار بار کی دیکھی' باہر کچھ تو نیا مل جاتا ہے' جو تصویر بنانے پہ مجبور کرے۔"

"کچھ نیا بنایا؟" میں نے اپنی بے چینی دور کرنے کے لیے موضوع بدلنا چاہا۔

"ہاں کوشش کی... مگر پورا نہ کرسکی۔" اس کا لہجہ مدھم پڑ گیا۔

"وہ کیا؟"

"بس تھا ایک منظر... اسے دیکھتے ہی ایک خوف سا محسوس ہوا کہ کہیں پلک جھپکتے ہی یہ منظر او جھل نہ ہو جائے اور پھر میں نے فوراً" ہی اسے اپنی اسکیچ بک میں قید کرنا چاہا... مگر... مگر سعد کچھ منظر قید کرنے کے لیے نہیں ہوتے۔ تتلی کی طرح اڑ جاتے ہیں ہاتھوں سے نکل کے۔ مگر جیسے جیسے تتلی ہتھیلی پہ رنگ چھوڑ جاتی ہے' وہ منظر بھی اپنے رنگ چھوڑ گیا ہے میری آنکھوں کی پتلیوں میں۔"

وہ کھوئے کھوئے انداز میں کہہ رہی تھی اور میں اس انجانے منظر سے جانا پہچانا حسد محسوس کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سوجی کے حلوے کی سوندھی سوندھی خوشبو' چکی کے پسے خالص گیہوں کے پراٹھے جو دیسی گھی میں تلے گئے تھے ان کی مہک پہ حاوی ہوگئی۔

"آج تو ناشتے پہ بڑا اہتمام ہے بھابھی۔ سعد پھر سے تو نہیں آرہا۔"

مہ پارہ کے سوال پہ کرسی سنبھالتے رضوان نے فوراً" پہلے سے ہی تنبیہہ کر ڈالی۔

"نہیں... وہ ویک اینڈ سے پہلے نہیں آئے گا اور نائلہ خبردار جو تم اس کے ڈرامے بازی میں آئیں اور اسے آنے کے لیے کہا تو۔"

"اوفوہ... ہاسٹل نہ ہوا کالا پانی ہوگیا۔"

نائلہ نے سر جھٹکتے ہوئے حلوے کی قاب رضوان کے آگے بڑھائی... اور پھر بات چھیڑی۔

"اچھا سنیں مجھے ایک بار دکھا دیجئے گا وہ ڈرائیور' دیکھ بھال کے تسلی کرلوں۔"

"اب تم ڈرائیوروں کو بھی جانچو گی۔"

رضوان نے ناگواری سے کہا... یہی ناگواری

براٹھے کا نوالہ توڑتی مہ پارہ کے چہرے پہ بھی جھلکنے لگی۔ مگر وجہ سراسر اور تھی۔

"توبہ ہے رضوان... لڑکی کا معاملہ ہے۔ بھلے ملازمہ ہے مگر چھ سال کی عمر سے پالا ہے اسے۔ ایسے کسی اچکے لفنگے کے ہاتھ دے دیں کل کلاں کو روتی بدکتی دوبارہ ہمارے ہاں آ کے بیٹھ گئی تو۔"

"جانا کہاں ہے دونوں نے... شادی کے بعد اس ڈرائیور کو فیکٹری کی بجائے یہیں حویلی کے لیے رکھ دوں گا۔ اکٹھے ہی کام کریں گے۔ تمہاری نظر کے سامنے۔"

"ہاں... مگر اس کا کوئی گھربار تو ہو گا۔ خاندان۔"

"بھابھی... بھائی جان کو سکون سے ناشتا تو کرنے دیں۔" مہ پارہ سے اور برداشت نہ ہوا۔

"ہاں نائلہ چائے منگواؤ جلدی مجھے جلدی نکلنا ہے۔ نیا کمشنر آیا ہے قصبے میں اس سے میٹنگ ہے۔"

مہ پارہ ناشتا ادھورا چھوڑ کے اٹھ گئی تھیں ان کے تو حلق تک میں زہر بھر گیا تھا سلمیٰ کی شادی اور رشتے کے ذکر سے۔

"سب کو اپنی اپنی ذمے داریاں یاد ہیں... حتیٰ کہ نوکرانیوں کی بھی۔ ان کو بھی ٹھکانے لگانے کی فکر ہے۔ ام ہانی کا سوچ سوچ کر ان کی راتوں کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں کہ بن ماں باپ کی بچی ہے۔ کیا منہ دکھائیں گے اوپر جا کے۔"

بڑبڑاتی ہوئیں وہ بڑے داوا کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کی دوا کا وقت تھا اور یہ ذمے داری مہ پارہ کے سر پہ ہی تھی۔

وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اونگھ رہے تھے۔ ان کا آلہ سماعت ان کے سینے پہ دھرا تھا۔ مہ پارہ ان کے سرہانے کھڑے ہو کے آنسوؤں سے ڈبڈبائی نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔ پھر کرلا کے سوال کیا۔

"کیا میں بن ماں باپ کی نہیں ہوں... میرا فرض ادا کرنا کسی کو یاد نہیں تھا... میرے معاملے میں کسی کو خدا کا خوف نہیں آتا... ملازمہ تک کا جوڑ ڈھونڈ لیا۔ میں نظر نہیں آتی کسی کو۔"

روتے روتے وہ نیچے بیٹھ گئیں اور ان کے پلنگ کے پائے سے سر ٹیک کے سسکنے لگیں۔

"کیا میرا وجود تنکے سے بھی ہلکا ہے؟"

آلہ سماعت نہ لگا ہونے کے باعث بڑے داوا اس کی سسکیوں اور شکووں کی آواز پہ تو نہ جاگے مگر ان کی ہچکیوں سے جو ان کے پلنگ کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگے اس سے ان کی آنکھ کھل گئی اور ان کا سر اپنے پلنگ کے پائے پہ دیکھ کے وہ ڈپٹ کے کہنے لگے۔

"کڑیئے اتھے کیوں سر رکھ کے بے گئی؟ جیوندا ہوں میں ابھی... مرا نہیں جے میرے پلنگ کی پٹی لگ کے بے گئی اے اٹھ... اٹھ شاباش۔"

☼ ☼ ☼

"مٹی کی خوشبو کتنی اچھی لگتی ہے ناں۔"

ام ہانی اپنی کلاس کے بچوں کے ساتھ کیاری میں گلاب کی نئی قلمیں لگا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ گیلی مٹی سے بھرے تھے۔

"ٹیچر اس میں پھول کتنے دن بعد لگیں گے؟"

"بہت جلدی بس روز اسے پانی دینا ہے اور حسن آپ نے اپنا یونیفارم کیوں بھر لیا مٹی سے دھیان سے بیٹا۔"

اور پھر ہاتھ جھاڑتی پانی کے پائپ کے پاس آنے لگی جہاں دو تین اور بچے گملوں پہ سرخ رنگ پھیر رہے تھے۔ ایک بچہ پھرتی سے آگے بڑھ کے پائپ تھامے ہوئے ہاتھ دھلانے میں اس کی مدد کرنے لگا۔

"کتنے خوب صورت لگ رہے ہیں یہ گملے رنگ ہونے کے بعد شاباش۔"

ہاتھ رگڑ رگڑ کے دھوتے ہوئے اس کے اسکول کے احاطے میں ایک گاڑی داخل ہوتے دیکھی۔ گیلے ہاتھوں سے ماتھے پہ آتے بال ہٹاتی وہ سیدھی ہوئی گاڑی سے اترتا سالار اعظم اسی جانب آرہا تھا لیکن اس کی حیران نظریں کیاری کے پاس کام کرتے بچوں پہ تھیں شاید ام ہانی کو وہ اب تک دیکھ نہیں پایا تھا۔

"آپ لوگ پڑھتے ہیں یہاں؟"

وہ کلاس تھری کے دلاور سے پوچھ رہا تھا۔۔۔ حالانکہ اس کا یونیفارم میں ہونا خود سالار کے سوال کا جواب تھا پھر بھی اس کے لہجے میں ایک بے یقینی سی تھی۔

"جی کلاس تھری۔"

"تو کلاس میں ہونے کی بجائے یہاں کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"کام۔" بچے نے سادگی سے اپنے مٹی سے لپے ہاتھ آگے کر کے دکھائے۔

"کام۔۔۔ یہاں پڑھنے بھیجا جاتا ہے آپ کو یا مزدوری کے لیے۔۔۔ کہاں ہیں آپ کے پرنسپل؟"

"فرمایئے کوئی کام ہے آپ کو؟"

ام ہانی دوپٹے سے ہاتھ خشک کرتی اس کے قریب چلی آئی۔ پہلی نظر میں ہی سالار کے انداز میں پہچان کی رمق چمکنے لگی۔ مگر کمال کا اختیار تھا اسے اپنے تاثرات پوشیدہ کرنے کا۔۔۔ اگلے ہی پل وہ نظریں پھر سے ناآشنا اور اجنبی تھیں۔

"آپ کسی بچے کے ایڈمیشن کے لیے آئے ہیں۔"

"آپ کی تعریف؟" وہ خشک لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"میں ٹیچر ہوں یہاں۔"

ام ہانی نے بھی جواباً اسی سرد مہری سے نوازا۔

"ٹیچر کا کام غالباً پڑھانا ہوتا ہے۔ بچوں سے بیگار لینا نہیں۔"

"بیگار؟" وہ حیران ہوئی۔

"مجھے یہ اسکول کم اور بیگار کیمپ زیادہ لگ رہا ہے جہاں معصوم بچوں سے اس چلچلاتی دھوپ میں اس قسم کے کام لیے جا رہے ہیں۔ آپ کے پرنسپل سے بات کرنا چاہوں گا میں کہ کس حق سے وہ بچوں سے اسکول کے ایسے کام لے رہے ہیں جن کے لیے انہیں تنخواہ دار ملازم رکھنے چاہئیں۔"

"یہاں ہر کام کے لیے ملازم ہیں۔۔۔ مالی سے لے کر پیون تک اور بچے مزدوری نہیں کر رہے، ہنر سیکھ رہے ہیں۔ باغبانی بھی ایک فن ہے۔"

ام ہانی نے اگرچہ بڑے تحمل اور نرمی سے صفائی دی تھی۔ مگر اس کا طنزیہ انداز ہنوز وہی تھا۔

"بہت خوب۔۔۔ اچھا نام دیا ہے آپ نے اسے مگر ان کے غریب والدین نجانے کس کس طرح جتن کر کے یہاں کی فیس اس لیے ادا نہیں کرتے کہ "آپ انہیں پڑھانے لکھانے کی بجائے باغبانی اور رنگ سازی سکھائیں۔"

اب مزید تحمل کا مظاہرہ کرنا ام ہانی کے لیے بھی دشوار تھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں کوئی فیس نہیں لی جاتی۔۔۔ یہ ٹرسٹ اسکول ہے۔ یونیفارم اور کتابیں تک مفت دی جاتی ہیں اور دوسری بات کہ ہنر اور فن کوئی بھی چھوٹا نہیں ہوتا اور تعلیم صرف کتابیں پڑھنے کا نام نہیں ہے۔ کچھ بھی سیکھنا علم حاصل کرنا کہلاتا ہے اور دیکھیے یہ کچھ سیکھ ہی رہے ہیں اپنے اردگرد کے ماحول کو صحت مند اور خوب صورت بنانا سیکھ رہے ہیں یہ۔۔۔ یہ بھی سیکھ رہے ہیں کہ "آگے چل کے انہیں صرف آرام دہ کاروں میں سوٹ پہن کے افسری نہیں کرنا بلکہ معاشرے میں ایک کار آمد رول بھی ادا کرنا ہے۔"

سالار کو اپنی ہی یادداشت پہ کچھ شبہ سا ہوا کہ کیا یہ وہی لڑکی تھی جو اس دن صرف آنسو بہانے اور بھاگ جانے کے سوا کچھ نہ کر پائی تھی۔

"چلیں۔۔۔ سب بچے ہاتھ منہ دھو کے وضو کر کے قاری صاحب کی کلاس میں جائیں درس کا وقت ہو گیا ہے۔"

بچوں کو لائن بنا کے اندر بھیجتے ہوئے اس نے مڑ کے سالار کو دیکھا جو کار کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"اور ہاں ایک اور بات۔۔۔" سالار نہ چاہتے ہوئے بھی رک کر سننے لگا۔

"یہ ٹرسٹ اسکول آپ جیسے لوگوں کے لیے نہیں۔ آپ اپنے بچے کو کسی مہنگے اسکول میں داخل کرائیں جہاں اسے مٹی سے محبت سکھانے کی زحمت نہ دی جائے۔"

سالار نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ کے اسے واپس

موڑنے لگا۔
"کہاں سے آجاتے ہیں مفت کے لیکچر دینے۔"
بڑبڑاتے ہوئے وہ بچوں کی لائن درست کرانے لگی۔
"ٹیچر یہ کون تھے؟"
"تھے کوئی... غلطی سے ہمارے اسکول آگئے۔ میں نے انہیں راستہ بتادیا ہے۔" اور مڑ کے گیٹ سے نکلتی گاڑی کو دیکھ کے سوچنے لگی۔
"اچھا ہی ہوا جو میں وہ اسکیچ مکمل نہ کرسکی... کچھ منظر صرف دور سے ہی اچھے لگتے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

"اوہ... تو وہ ٹرسٹ اسکول آپ کا ہے؟" سالار اعظم کی رضوان سے ایک غیر رسمی سی ملاقات تھی یہ اور باتوں باتوں میں ہی اسے علم ہوا۔
"ٹرسٹ ہے۔ فلاحی۔ تو ہمارا تو نہ ہوا... عوام کا ہے۔" رضوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"صحیح... میں اتفاقاً" آج ہی وہاں گیا تھا انسپکشن کے لیے۔"
"تب ہی مجھے علم ہوا تھا کہ 'نئے کمشنر صاحب بہ نفس نفیس ہر جگہ خود جارہے ہیں۔ میں بہت متاثر ہوا۔"
"میں بھی بہت متاثر ہوا یہ جان کر کہ اس علاقے کے صاحب حیثیت لوگوں کو یہاں کے عام رہنے والوں کی ضروریات کا اتنا خیال ہے۔" سالار اعظم نے رضوان کی خوشدلی سے کی تعریف کا جواب خوشدلی سے دینا چاہا۔
"کیسا لگا آپ کو اسکول کا معیار؟"
"ویل... ویسے تو سب ٹھیک ہے، مگر آپ نے جو اسٹاف وہاں پہ..." سالار کی بات ام ہانی کو آفس میں داخل ہوتے دیکھ کے ادھوری رہ گئی وہ بھی رضوان کو سلام کرتے ہی اسے دیکھ کے بالکل اسی کے انداز میں چپ ہوکے رہ گئی۔
"ارے آؤ بیٹا... تمہیں اپنے مہمان سے ملواتا ہوں۔ یہ ہمارے نئے کمشنر ہیں۔ عرصے بعد ہمارے علاقے کو کوئی اتنا فرض شناس اور ذمے دار آفیسر ملا ہے اور سالار صاحب یہ میری بیٹی ہے۔ ام ہانی۔"
"خوشی ہوئی آپ سے مل کے۔" سالار اعظم کا لہجہ سراسر رسمی تھا۔
"رضوان شاہ کی بیٹی سے مل کے ہوئی ہوگی خوشی' ایک ٹرسٹ اسکول کی معمولی ٹیچر سے مل کے تو نہیں ہوئی تھی۔"
"اوہ... لگتا ہے آپ دونوں پہلے مل چکے ہیں۔"
"میں چلتی ہوں بڑے ابو... آپ بزی ہیں گھر پہ بات کرلوں گی۔" وہ چلی گئی، مگر سالار اعظم کے پھر وہاں بقیہ تیرہ منٹ بڑی مشکل سے کٹے۔

☼ ☼ ☼

"تاجدار حرم... ہو نگاہ کرم..."
جمعے کا دن اور لاہور کا داتا دربار... ایک ہجوم تھا۔ نہ صرف لاہور کے بلکہ گردونواح سے کتنے ہی لوگ اس دربار کے احاطے میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے آتے تھے۔ قوالوں کی ٹولیاں جگہ جگہ بیٹھی تھیں۔ کئی اطراف سے نعتوں کی پرسوز آوازیں گونج رہی تھیں۔ عطر اور اگربتی کی مہک میں ڈوبا ہوا ماحول...
"جمعے کی نماز بھی پڑھ لیں گے۔ فاتحہ بھی ہوجائے گی مزار پہ... اور ساتھ میں یہ بھی لینا تھا مجھے۔"
سر پہ رومال باندھتے ہوئے شعیب سیڑھیوں کے پاس چادر بچھا کے چوڑیاں اور کڑے بیچتی عورت کے پاس رکا۔
"گرل فرینڈ کے لیے؟"
میں نے ہونق بن سے پوچھا۔ ذلیل انسان جمعے کی باجماعت نماز پڑھنے کا کہہ کر یہاں مجھے اتنے رش میں گھسیٹ لایا اور اب گرل فرینڈ کے لیے چوڑیاں لے رہا تھا۔
"ابے نہیں۔ ایسی کوئی مخلوق ابھی مجھے ملی نہیں۔ یہ تو آپا کے لیے لے رہا ہوں۔"
"تو کسی اچھی جگہ سے لو۔ یہ تو ہیں بھی سب سیاہ

رنگ کی۔ عجیب۔ بھدی سی۔"

"یہ منت کی چوڑیاں ہیں۔۔۔ اماں نے کہا تھا۔ یاد سے لاؤں آپا کی شادی کی عمر گزر رہی ہے نا۔ رشتہ نہیں آرہا۔ اب اگر اماں کا عقیدہ ہے کہ یہ چوڑیاں پہننے سے رشتہ جلدی آجائے گا تو کیا کیا جاسکتا ہے۔" اس کی بات سے مجھے بھی دور کی کوڑی سوجھی۔

"یار شعیب۔۔۔ میری پھوپھو کی بھی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ ان کے لیے بھی لے لوں؟ قسم سے امی اور ہانی دونوں بہت دعائیں دیں گی مجھے اگر واقعی ان چوڑیوں نے کام کر دکھایا تو۔"

"ضرور۔۔۔ اور اگر ان کے ساتھ کسی ناکام عشق والی کہانی جڑی ہے تو یہ موٹی والی کالی چوڑیاں لو۔ وہ بھی دو عدد۔۔۔ یہ پسند کی شادی کی منت کی ہیں۔"

"واقعی؟"

"ہاں۔ لڑکیاں دور دور سے آکے لیتی ہیں۔ ان کو پہننے سے ان کی شادی وہیں ہو جاتی ہے جہاں وہ چاہتی ہیں۔ یہ ان کا ماننا ہے۔" قوالیوں کا شور اچانک تھم گیا۔

"لگتا ہے اذان ہونے والی ہے۔" اور شعیب کا اندازہ درست تھا اگلے ہی لمحے لاؤڈ اسپیکر اذان کی آواز سے گونج اٹھے۔

"چل یار۔ چھوڑ چوڑیاں۔۔۔ میں نہیں مانتا ان باتوں کو۔۔۔ نماز کا وقت ہو رہا ہے۔"

میں اسے کھینچتا ہوا آگے لے گیا یہ نہ بتایا کہ اس وقت دل میں کیا بونگا سا خیال آیا تھا کہ کاش مرد ہونے کے باوجود میں بھی یہ کانچ کی وہ بھدی موٹی کالی چوڑیاں پہن سکتا کیا پتا واقعی ان کی کرامات سے۔۔۔

☼ ☼ ☼

صرف تیرہ منٹ۔۔۔ صرف اور صرف تیرہ منٹ وہ مزید رک سکا تھا اس آفس میں اور پھر رہ نہ سکا۔ اور ایک ضروری کام یاد آنے کا کہہ کر رضوان سے معذرت کرتا نکل آیا تھا۔

اس نے محض اندازے سے اپنی کار دائیں جانب کو جانے والی سیدھی سڑک پہ موڑی تھی اور اس کا اندازہ درست تھا اس سڑک پر دور وہ سفید دوپٹے اور ہلکے کاسنی کرتے پاجامے والی لڑکی پیدل چلتی جارہی تھی۔ ڈرائیور کو کچھ دیر بعد اس نے رکنے کا کہا اور پیدل چلتا اس کے پاس پہنچا۔

"سنو۔۔۔" اس کے پکارنے پہ ام ہانی نے مڑ کے دیکھا ضرور۔۔۔ کچھ حیران بھی ہوئی اور سالار کی طرح اسے اپنے تاثرات چھپانے پہ ملکہ نہیں تھا اس لیے اس حیرت کو اس کی جانب اچھال کے وہ نظر انداز کرتی دوبارہ چلنے لگی۔

"میں تم سے مخاطب ہوں۔"

"مجھے بچپن سے سکھایا گیا ہے کہ راہ چلتوں سے مخاطب نہیں ہوتے۔" بغیر رکے اس نے جواب دیا۔

"راستے پہ اس وقت تم چل رہی ہو۔ بائی دا وے۔ اتنے بڑے آدمی کی بیٹی ہو کے پیدل جارہی ہو۔" اب کے وہ رکی اور تنک کے بولی۔

"کیوں؟ بڑے گھروں میں پیدا ہونے والے معذور ہوتے ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ مگر عموماً" احساس سے عاری ہوتے ہیں وہ انسان۔" وہ مسکرایا کہ بہر حال اسے رکنے پہ تو مجبور کر ہی دیا تھا۔

"جس میں احساس باقی نہ رہے وہ انسان ہی کہاں ہوتا ہے۔" اسے لاجواب کرنے کے بعد ام ہانی نے دوبارہ قدم بڑھائے۔

"تصویر مکمل کب کرو گی؟" وہ اچانک اس کے سامنے آتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"کبھی نہیں۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے دو ٹوک جواب دیا۔

"مگر میں کوئی چیز کبھی ادھوری اور نامکمل نہیں رہنے دیتا۔"

"اور میں کوئی ایسا کام مکمل نہیں کرتی جس پہ میرا دل نہ مانے؟"

اس بار وہ آگے بڑھی تو سالار نے اس کے پیچھے اپنے قدم نہ بڑھائے۔

☆☆☆

میرا دل چاہتا تو دن کے ہر دوسرے پل اسے فون کرتا۔ اور گزرے پچھلے پل کا سارا حال سناتا۔ مگر بہرحال رات سونے سے پہلے ایک لمبی کال۔۔۔ یہ معمول تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ بہت کچھ ہوتا تھا میرے پاس اسے سنانے کے لیے اور پتا نہیں کیوں مجھے بتانے کے لیے اب اس کے پاس زیادہ کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ بس میری سنتی، کبھی ہنستی، کبھی ٹوکتی، کبھی بگڑتی۔

"میں کیا کروں گی ان چوڑیوں کا؟" میں نے اسے منت والی چوڑیوں کا بتایا تو وہ پھر سے ہنس دی۔

"ان کو پہننے سے شادی وہیں ہو جاتی ہے، جہاں دل چاہتا ہو۔"

"تو ایسا کرو سلمیٰ کے لیے لے آؤ۔ اس کی لو اسٹوری آج کل تباہی کے دہانے پہ ہے۔"

"اس کے لیے کیوں لاؤں؟ وہ کیا لگتی ہے میری؟" میں بری طرح چڑ گیا اور وہ کھلکھلا کے ہنسنے لگی۔ میری چڑچڑاہٹ اور کوفت اس کی ہنسی کی آبشار میں بہہ گئی۔

"تم خاموش مت ہونا ہنی۔ ہنستی رہنا۔ ہمیشہ۔"

"بدھو۔۔۔ بلاوجہ ہنستی رہوں؟ پاگل ہوں کیا؟"

"ہنستے رہنے سے پاگل نہیں ہوتے ہاں کسی کسی کی ہنسی پاگل ضرور کر دیتی ہے۔"

میری بات پہ وہ پھر سے ہنس پڑی۔ اور یہ کھلکھلاہٹ اس کے فون بند کرنے کے بعد بھی دیر تک مجھے لہروں کی طرح یہاں وہاں اچھالتی رہتی۔ یہاں تک کہ۔۔۔ کہ پھر سے وہی انجانا خوف جو گھات لگائے بیٹھا تھا۔ پھر سے مجھ پہ حملہ آور ہوا۔ میں بے چین ہو کے کچی نیند سے اٹھ کے بیٹھ گیا۔

وہی کچھ چھن جانے کا خوف۔ کچھ بچھڑ جانے کا۔۔۔ کچھ لٹ جانے کا ڈر۔۔۔

☆☆☆

بکری کا وہ ننھا سا برف کے گولے جیسا بچہ مستی میں یہاں سے وہاں گھاس پہ لوٹیں کھا رہا تھا اور ام ہانی مسکراتے ہوئے اس کا اسکیچ بنانے میں مصروف تھی۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پہ موجود ایک بڑے سے سیاہ پتھر پر بیٹھی۔۔۔

فجر کی نماز کے بعد وہ جب صبح کی سیر کے لیے نکلتی تو اپنی اسکیچ بک اور پنسل ضرور ساتھ رکھتی۔ ایسے ہی کسی منظر کو قید کرنے کے لیے جو اس کے دل کو بھا جائے اور تب اس کی مسکراہٹ اچانک غائب ہو گئی جب اس نے جاگنگ سوٹ میں ملبوس سالار اعظم کو اس جانب آتے دیکھا۔ ام ہانی نے فوراً" اسکیچ بک بند کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رکو۔۔۔ مجھے بات کرنی ہے تم سے۔"

"مگر مجھے نہیں کرنی۔"

وہ تیز تیز چلنے لگی۔ سالار بھی اس کے ساتھ لمبے لمبے قدم اٹھانے لگا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ تم مت کرنا۔۔۔ صرف سن لینا۔"

"مجھے سننا بھی نہیں ہے۔ پلیز۔۔۔ آپ ایسے میرا راستہ نہ روکا کریں۔۔۔ آہ۔"

اچانک وہ درد سے کراہ اٹھی۔ تیز چلنے کی وجہ سے اور سارا دھیان ساتھ ساتھ چلتے بلاوجہ فری ہوتے سالار پہ ہونے کی وجہ سے وہ اس پتھر کو دیکھ نہیں پائی جس سے اس کا دایاں پاؤں بری طرح ٹھوکر کھا کے مڑ گیا تھا۔

وہ اپنے پیر کو تھامتی۔۔۔ درد سے آنکھیں میچتی اسی پتھر پہ بیٹھ گئی۔ اس کے انگوٹھے کا ناخن ٹھوکر کھانے سے جلد سے اکھڑ کے ایک جانب جھول رہا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ سالار اس کے سامنے آکھڑا ہوا تو ام ہانی نے اپنی آنسو بھری سرخ آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا اور اپنی سسکی روکنے کی کوشش کی۔

اپنے تاثرات چھپانے میں ملکہ رکھنے والے سالار اعظم کا پگھلتا دل اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگا اس کے نقوش بھی اس کے دل کے ساتھ ساتھ پگھل رہے تھے جیسے' وہ پیروں کے بل وہیں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور بن کچھ کہے اس کے پیر کی جانب ہاتھ بڑھائے اور ام ہانی نے فوراً" ہی جھجک کے اپنے پیر کو

پیچھے کر دیا تھا۔

سالار نے اپنا ہاتھ مزید آگے بڑھانے کے بجائے اسے ہی آنکھ سے پیر آگے کرنے کا اشارہ کیا، مگر جب وہ انکار میں سر ہلانے لگی تو ناچار اس نے خود ہی اس کا پیر تھام کے اپنے سامنے کیا۔ ام ہانی نے مزاحمت کی کوشش کی، مگر سالار کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ سسکی بھر کے رہ گئی۔ سالار نے جیب سے رومال نکال کے اس کے اکھڑتے جھولتے ناخن پہ رکھ کے ہلکا سا دبایا تو درد کی شدت سے تڑپ کے وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے رومال والے ہاتھ پہ رکھ کے رونے لگی۔

"نہیں پلیز۔"

سالار نے دوسرے ہاتھ سے نرمی سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ سے ہٹائے اور گہری نظر اس کے چہرے پہ ڈالی۔ درد سے بے حال ام ہانی نے اب لب بھینچ رکھے تھے اور آنکھیں زور سے میچی ہوئی تھیں۔ بند آنکھوں سے جھڑ جھڑ آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے چہرے پہ یونہی نظر جمائے سالار نے اس کے ناخن کے اس بقیہ حصے کو ابھی اکھاڑنا چاہا تو وہ ہلکا سا چلا اٹھی چہرے پہ درد کہیں زیادہ بڑھ گیا اور سالار کی نظریں اور بھی گہری ہو گئیں۔

سالار دھیرے دھیرے اس کے ناخن کو جڑ سے اکھاڑ رہا تھا اور ام ہانی کے ہاتھ پھر سے اس کے ہاتھ پر جمے تھے۔ اب وہ اسے روکنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی، مگر درد کی شدت سے رہ رہ کے اٹھنے والی چیخوں کو روکنے کے لیے اس کے ناخن قریباً" سالار کے ہاتھ کی پشت میں کھب رہے تھے اور سالار... اسے تو جیسے اس چیز کا کوئی احساس ہی نہیں تھا وہ یک ٹک اس کی بند پلکوں سے جھڑ جھڑ کر کے گرتے آنسوؤں کو دیکھتا جا رہا تھا جیسے پورے جہاں میں ان کے سوا دیکھنے لائق کوئی منظر ہی نہ ہو۔

اور آخر ناخن جڑ سے اکھڑ گیا۔ خون ابل کے بہا اور رومال کو سرخ کر گیا۔ ام ہانی جو دیر سے سسکیاں دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ سالار کا ہاتھ بے ساختہ آگے بڑھا اور اس کے آنسوؤں کو اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں پہ چننا چاہا تو ام ہانی رونا بھول گئی۔ تڑپ کے پیچھے ہٹی۔

اس کی سرخ روئی روئی آنکھوں کی حیرت بھی سالار کی خصوصیت کو توڑ نہ سکی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا پاؤں سالار کی گرفت سے چھڑایا وہ تب بھی اسی بے خودی میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی وہ وہیں پنجوں کے بل بیٹھا رہا۔

وہ لنگڑاتے ہوئے وہاں سے جانے لگی تب بھی نہ ہلا۔ یہاں تک کہ چند قدم چلنے کے بعد ام ہانی نے مڑ کے اسے دیکھنا چاہا تو سالار اعظم اس پگڈنڈی کے پاس پڑے بہت سے پتھروں میں سے اب ایک پتھر تھا۔

☼ ☼ ☼

میں نے سچ کہا تھا شعیب سے۔ میرا دل اس کے بارے میں غلط سگنل دے ہی نہیں سکتا۔ یہ عجیب بے سکونی جو کئی روز سے مجھ پہ غلبہ کیے ہوئے تھی جس کا سبب جاننے سے میں قاصر تھا اس کا جواب رات کو ہنی سے فون پہ بات ہوتے ہی مل گیا۔

"ایسے کیسے لگ گئی چوٹ؟" میں تڑپ اٹھا تھا۔ دانتوں تک کے اندر درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔

"بس لگ گئی..." اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا تھا۔

"ہاں... مگر کیسے؟"

"اب کیا دوبارہ ٹھوکر لگوا کے دکھاؤں؟" وہ جھنجلا رہی تھی۔

"خون بھی نکلا تھا؟" میں جیسے کراہ اٹھا۔ پھر سے ایک خاموش لمحہ... اور ایک مختصر جواب۔

"ہاں۔"

"تم روئیں ہنی؟" اور پتا نہیں کیوں میرے ہر سوال کے جواب میں وہ ایک ثانیے کے لیے چپ سی ہو جاتی تھی۔

"نہاں... کوئی نہیں۔" اور میں جانتا تھا یہ سفید جھوٹ تھا۔

"جھوٹ... تم روئی تھیں۔ میں کہہ رہا ہوں نا تم

روئی تھیں تو بس روئی تھی۔ تمہیں کس نے چپ کرایا ہوگا بنی۔"

"بدھو۔۔۔ میں کوئی بچی ہوں جو ذرا سی چوٹ پر روؤں گی۔"

"میں کل ہی آتا ہوں۔"

اچانک میں نے فیصلہ کرلیا۔

"خبردار۔۔۔ اگر تم مجھے روتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تو میں بھی تمہیں ڈانٹ کھاتا نہیں دیکھ سکتی اور کل تو کیا تم اس ویک اینڈ پہ بھی نہیں آؤ گے۔"

"کیا؟ دو دن بعد ویک اینڈ پہ بھی نہیں؟ کیوں؟" میں اس کے سفاک حکم پہ احتجاج کرنے لگا۔

"منڈے کو تمہاری پریزنٹیشن ہے بدھو۔۔۔ خاک تیاری کی ہے تم نے۔ یہاں آگئے تو کچھ بھی نہیں کرسکو گے وہاں رہ کے کام کرو اچھا سا۔۔۔ منڈے کو زبردست سی پریزنٹیشن دو اور پھر اگلے ویک اینڈ پہ آنا۔۔۔ اوکے۔"

"اوکے۔" مرے مرے لہجے میں کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔

"کیا ہوا۔۔۔؟ منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔" شعیب نے روم میں داخل ہوتے ہی مجھ سے پوچھا۔

"میں نہیں جا رہا اس ویک اینڈ پہ۔۔۔"

"کیوں؟ حکم یار ہے کیا؟" وہ چڑانے لگا۔

"ہاں۔۔۔ اور میں اس کا کہا ٹال نہیں سکتا۔۔۔ مگر۔۔۔ یار اتنے دن اس سے دور رہنا بھی تو ایک عذاب ہے۔ مر جاؤں گا۔"

شعیب نے چند سیکنڈ غور سے مجھے دیکھا جیسے اندازہ لگانا چاہ رہا ہو کہ میں مرنے والا ہوں یا نہیں۔۔۔ پھر میرا شانہ تھپتھپا کے سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"کبھی کبھی جدائی کچھ نہیں کہتی۔۔۔ قربت مار دیتی ہے۔"

☼ ☼ ☼
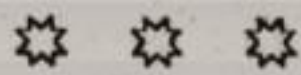
"صدیق چچا۔۔۔ اتنا سا کام کہا تھا آپ سے وہ بھی نہیں کیا۔۔۔ صدیق چچا۔" پیون کو پکارتی وہ اسکول کی راہداری میں سے گزر رہی تھی اور پھر ان کا اسٹول خالی دیکھ کے کوفت سے بڑبڑا کے رہ گئی۔

"پھر سے غائب۔۔۔ سرکاری اسکول والا حال بنا دیا ہے ان لوگوں نے۔۔۔ جس کو دیکھو بنا بتائے کبھی بھی غائب۔۔۔"

اس نے دو دن پہلے پیتل کا جو گھنٹا لا کے دیا تھا وہ ابھی تک جوں کا توں اسی اسٹول کے پاس رکھا تھا۔ گرمی کے بڑھتے ہی اس چھوٹے سے قصبے میں بجلی جانے کا دورانیہ زیادہ ہو جاتا تھا اور اسکول کے اوقات میں تو اکثر بجلی ہوتی ہی نہیں تھی۔ ام ہانی نے یہ پیتل کا گھنٹا منگوایا تھا تاکہ چھٹی' اسمبلی اور ہر کلاس کے ختم ہونے پہ اسے بجا دیا جائے۔ اب جو اسے تاؤ آیا تو اسٹول گھسیٹا اور اس پہ چڑھ کے خود ہی دیوار سے ٹانگنے لگی۔ مگر گھنٹا خاصا بھاری تھا۔ پھسل پھسل جا رہا تھا ہاتھ سے۔۔۔ اور پیر کے انگوٹھے کی چوٹ کی وجہ سے وہ صحیح طریقے سے اسٹول پہ قدم بھی نہیں جما پا رہی تھی۔

تب ہی دو ہاتھ گھنٹے پہ آ کے رکے اس نے چونک کر دیکھا یہ سالار اعظم تھا جو اس سے لینے کے بعد بڑی سہولت سے گھنٹے کو دیوار سے جھولتے ہک سے لٹکانے لگا۔ وہ خاموشی سے دیوار کا سہارا لے کر اسٹول سے اترنے لگی جو ڈگمگا رہا تھا۔ گھنٹا لٹکانے کے بعد سالار نے فوراً" ہاتھ بڑھا کے اسے کہنی سے تھاما اور اسٹول سے نیچے اترنے میں مدد دی۔

"چھوڑیں مجھے۔۔۔ نہیں گرتی میں۔"

نیچے اترتے ہی اس نے اپنا بازو سالار سے چھڑوایا۔

"کیسا ہے اب پیر کا زخم؟"

سالار اس کے انگوٹھے پہ بندھی پٹی دیکھ کے پوچھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے اب۔۔۔" مختصر کہہ کر وہ اس سے آنے کا سبب پوچھنے ہی والی تھی کہ اسے گھنٹا بجاتے دیکھ کے ہڑبڑا اٹھی۔

"ارے۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ آپ۔۔۔ یہ کیوں۔"

مگر گھنٹے کی آواز میں اس کی آواز دب سی گئی۔ وہ

متوحش نظروں سے کبھی مسلسل گھنٹے بجاتے سالار کو تو کبھی جماعتوں سے نکلتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا کیا آپ نے؟ ابھی چھٹی ہونے میں پورے پچیس منٹ باقی ہیں۔" سالار کے رکتے ہی اس نے غصے سے کہا۔

"کیوں کہ مجھے اپنی تصویر مکمل کرانی ہے۔" وہ سکون سے کہہ رہا تھا۔ ام ہانی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا' مگر الفاظ... الفاظ جانے کہاں تھے وہ انکار کرنا چاہتی تھی۔ شدت سے... مگر انکار کی ہمت جانے کہاں تھی۔

"اب بھی دل نہیں مان رہا؟" وہ ہلکا سا مسکرایا اور ام ہانی کو لگا انکار کی وہ ہمت... وہ الفاظ سب شاید اس مسکراہٹ کی تاب نہ لا کے ہی کہیں چھپ گئے تھے۔

"کہاں بناؤ گی اسکیچ؟ یہیں؟ یا نہر کنارے؟" اب ام ہانی نے ہتھیار ڈال دیے۔

"نہر کنارے کل صبح۔"

☆ ☆ ☆
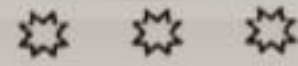
مجھے صبح کی پہلی پھٹنے سے بھی خوف آرہا تھا۔

نجانے کیوں یہ پھٹتی بلکتی جس سے بھری رات اتنی عزیز ہورہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا اس رات کو اپنی آغوش میں ایسے بھرلوں کہ یہ کہیں جانہ سکے دن کا اجالا آنے کی ہمت نہ کرسکے۔

میں نہیں جانتا تھا آنے والی صبح کی ہیبت مجھ پہ ابھی سے کیوں طاری ہورہی تھی۔

میں نہیں جانتا تھا وہ کیا تھا۔ جو مجھ سے چھن جانے والا ہے... میں نہیں جانتا تھا۔ میں کیا کھونے والا ہوں۔ اور صبح کو ہونے سے روکنا' میرے بس میں نہیں تھا۔

صبح ہو کے رہی... کیا کچھ' چھن جانے اور کھو جانے کو روکنا میرے بس میں تھا؟

شاید...

شاید وہ بھی نہیں...

دور کہیں... کچھ تھا۔ جو مجھ سے دھیرے دھیرے

چھن رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

کورے ورق پہ دھیرے دھیرے وہ ساحر نقوش ابھر رہے تھے اور ام ہانی حیرت میں تھی۔ کہ اس چہرے کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بھی کتنا حوصلہ چاہیے اور وہ... وہ ایک نظر میں دو دو بار دیکھ رہی تھی۔

نظر اٹھاتی تو سامنے وہ... نظر جھکاتی۔ تو گود میں رکھی کاپی کے ورق پہ وہ...

"ہو گئی مکمل؟" ام ہانی نے تھکن سے بھرپور انداز میں ایک گہری سانس لی تو کب سے ایک زاویے پہ بیٹھے سالار نے پوچھا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کے رہ گئی۔

"شومی" ام ہانی نے سٹپٹا کے کاپی بند کی تو سالار نے اس کے ہاتھ سے لے لی۔ پہلی نظر اس اسکیچ پہ ڈالتے ہی اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔

"اس میں میری آنکھیں بند کیوں ہیں؟"

"وہ... میں نے... میں نے اس تصویر میں آپ کو سوتا ہوا دکھایا ہے۔"

"مگر میں نے یہ تصویر جاگتے میں بنوائی ہے بتاؤ... کیوں میری آنکھیں بند دکھائی ہیں تم نے؟" وہ اس کے چہرے پہ نظر جمائے پوچھ رہا تھا اور وہ نظر چرا رہی تھی۔

"بتاؤ ام ہانی۔" آخر ہانی نے نظر اٹھائی تو وہ اب تک اسے اسی انداز میں دیکھ رہا تھا۔ آخر جھنجلا اٹھی۔

"اس لیے نہیں بنائی۔"

"کس لیے؟" وہ مزید حیران ہوا۔

"آپ... آپ نا... آپ دیکھتے بہت ہیں۔" اس کے بے چارگی بھرے شکوے پہ سالار مسکرا اٹھا۔

"تو آنکھوں کا اور کام کیا ہے؟"

"آپ کی نگاہوں سے تو میں نظر چرا لیتی ہوں... مگر... مگر وہ تصویر جو بنا رہی ہوں اس پہ سے کیسے نظر ہٹاؤں اس لیے آنکھیں بند دکھا دیں کہ سکون سے تصویر تو مکمل کرسکوں۔"

سر جھٹکتے ہوئے وہ گلہ بھی کررہی تھی اور ساتھ

ساتھ اپنی چیزیں بھی سمیٹ رہی تھی۔ کتنی دیر ہو گئی یہاں سے اب سیدھا اسکول کے لیے نکلنا ہوگا" اس نے گھڑی میں وقت دیکھنے کے لیے کلائی چہرے کے سامنے کی تو سالار نے اس کی وہی کلائی تھامی اور جھٹکے سے اپنی جانب کھینچا وہ اس کے سینے سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ ابھی سنبھلنے نہ پائی تھی کہ سالار نے اسے بالکل ہی بے جان کر ڈالا۔ اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر کے۔

"اب کیسے بند کرو گی میری آنکھیں؟"

"چھوڑیں مجھے" سرگوشی سی نکلی اس کے کپکپاتے لبوں سے۔

"اور نہ چھوڑوں تو؟ رو دو گی؟" جواب میں ام ہانی کی آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھر گئے۔ سالار نے دھیرے سے اپنے ہاتھ اس کے رخساروں سے ہٹائے۔

"میں نہ تو تم سے یہ پوچھوں گا کہ تم کسی اور کو چاہتی ہو یا نہیں۔ تمہاری زندگی میں کوئی اور ہے یا نہیں۔ میں یہ پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کروں گا کہ تم انگیج تو نہیں۔ میں یہ بھی نہیں جاننا چاہتا ام ہانی۔ کہ تم مجھے پسند کرتی ہو یا نہیں۔ مجھے تم اچھی لگی ہو۔ بس یہ کافی ہے۔"

وہ دم بخود اسے سنتی جا رہی تھی اور وہ کہتا جا رہا تھا۔

"اور جو مجھے اچھے لگتے ہیں وہ میرے ہو جاتے ہیں ام ہانی۔ اب تم میری ہو۔"

☼ ☼ ☼
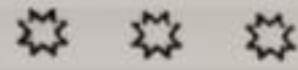
میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ جیسے تیز ہواؤں کے جھکڑ چل رہے ہوں۔ کلاس روم میں نہیں جیسے کسی لق و دق صحرا میں کھڑا ہوں جہاں چاروں جانب ریت اڑ رہی ہو۔ ریت کی کرکراہٹ مجھے اپنے دانتوں تک پہ محسوس ہو رہی تھی اور پلکوں پہ بھی۔ میں نے پلکیں مسلنا چاہیں۔

"سعد ڈو یو گیٹ دا پوائنٹ"

سر مختار کی آواز بازگشت بن کے گونجی۔ میں نے پلکیں مسل کے حیرت سے انہیں دیکھا۔ مجھے تو لگا تھا اس صحرا میں اس اڑتی ریت میں دور دور تک سوائے میرے اور کوئی نہیں ہے۔ پھر سر مختار یہاں کیسے۔ ریت کے اڑتے بگولوں کے پار ان کا ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔

"سعد آئی ایم ٹاکنگ ٹو یو۔" اور پھر شعیب۔ جانے وہ بھی کہاں سے کود پڑا اور میرا بازو پکڑ کے زور سے ہلایا۔

"سعد۔" میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ ریت تو نہیں اڑ رہی تھی۔ کلاس روم میں۔ جھکڑ نہیں چل رہے تھے۔ میں گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا تمہیں سنائی نہیں دے رہا" سر مختار طنز سے مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

"Excuse me sir" ایکسکیوز می سر!

مجھ سے اس کے علاوہ کچھ اور نہ کہا گیا اور میں تیزی سے کلاس روم سے نکل آیا طویل راہداری۔ سیڑھیاں۔ پھر ایک اور طویل راہداری۔ وسیع و عریض گراؤنڈ اس اڑتی ریت اور سائیں سائیں نے میرا تعاقب ہر جگہ کیا۔

کچھ تھا جو کھو رہا تھا۔ کچھ تھا جو چھن رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"جو مجھے اچھے لگتے ہیں۔ وہ۔ میرے ہو جاتے ہیں ام ہانی اور آج سے تم میری ہو۔"

ام ہانی کو ایسا لگا ضرور اس کی سماعتوں نے دھوکا کھایا ہے۔ وہ گنگ سی اسے دیکھتی رہی پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"مم۔ مگر۔"

لیکن اسی وقت سالار کی انگلی اس کے لبوں پہ آ کے ٹھہر گئی۔ وہ ایک پل میں سوہنی کے کچے گھڑے کی طرح چناب کی تند لہروں کے سپرد ہو گئی۔

"اس کے بعد اگر مگر کی گنجائش نہیں رہتی۔" وہ کہہ رہا تھا اس کے لبوں پہ انگلی رکھے اور کچا گھڑا لہروں پہ اچھل رہا تھا۔

"جب کسی کے ہو جاتے ہیں تو بس ہو جاتے ہیں۔ سوال نہیں کرتے۔ جواب نہیں مانگتے۔"

اور کچا گھڑا ان لہروں میں کہیں کھو گیا... سپردگی کی انتہا تو یہی ہوتی ہے نا۔

☆ ☆ ☆
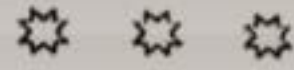
میں خالی خالی نظروں سے سامنے گراؤنڈ میں کچھ لڑکوں کو فٹ بال کھیلتے دیکھ رہا تھا جب شعیب میرے پاس آ کے تشویش سے کہنے لگا۔

"سعد..."

میں نے ان ہی خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا اور پتا نہیں اسے میرے چہرے پہ کیا نظر آیا جو اس کی تشویش خوف میں بدل گئی۔

"کیا ہوا ہے تمہیں سعد؟"

"کیا ہوا ہے؟" میں نے الٹا سوال کیا۔

"یہ تو تمہیں پتا ہو گا... کتنی محنت کی تم نے اپنی پریزنٹیشن پہ... اور سر کے سامنے ایسے بلینک ہو گئے جیسے... ہوا کیا ہے آخر؟"

"پتا نہیں... تم صحیح کہہ رہے ہو... میں واقعی بلینک ہو گیا تھا۔ کورے کاغذ کی طرح... ریت کے جھکڑ میں اڑتے ایک معمولی تنکے کی طرح... یہاں سے وہاں اڑتا ہوا... بے مقصد۔"

"کیا ہانک رہے ہو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں شعیب اچانک بیٹھے بٹھائے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ ایسا لگا میرے اندر سے سب کچھ غائب ہو گیا ہو... کسی نے میری روح تک کھینچ لی ہے۔ خالی پن بالکل خالی۔"

"یار تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" شعیب نے مجھے بازو سے پکڑ کے اٹھایا۔

"شاید نیند نہ پوری ہونے کی وجہ سے... جا... ہاسٹل جا کے سو جا۔"

"جب میرے اندر کچھ رہا ہی نہیں... تو نیند کہاں رہی ہو گی۔"

☆ ☆ ☆

"تو پیا سے مل کے آئی ہے... بس آج سے نیند پرائی ہے۔"

ام ہانی قدم کہیں رکھ رہی تھی۔ پڑتے کہیں اور تھے۔ آنچل جھول کے پیروں تک آ رہا تھا۔ لبوں پہ ایک مسکراہٹ تھی جو چھپائے نہ چھپتی تھی اور آنکھوں میں ایک خود فراموشی کی کیفیت۔ سلمیٰ پودوں کو پانی دیتے گنگنا رہی تھی۔

"تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے..."

ام ہانی کو یوں ڈولتے قدموں کے ساتھ حویلی داخل ہوتے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اسے تو اس وقت اسکول ہونا چاہیے تھا۔

"ہانی بی بی..."

"مگر ہانی تک اب کوئی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ نہ پہنچ سکتی تھی۔ اس کے کانوں میں تو بس ایک ہی بازگشت تھی۔

"تم آج سے میری ہو۔"

"ہانی بی بی اسکول نہیں گئیں آپ؟"

وہ سلمیٰ کے پاس سے گزرنے لگی تو سلمیٰ نے پانی کا پائپ پرے کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

"کچھ بول کیوں نہیں رہیں آپ ہانی بی بی۔"

اور وہ کیسے بولتی اس کے لبوں پہ تو ابھی تک وہ انگلی دھری تھی۔ شش... چپ...

اور وہ اس عالم بے خودی میں اس کے پاس سے گزر کے چلی بھی گئی۔ سلمیٰ نے حیرت سے دیکھا اور پھر سر جھٹکتے ہوئے دوبارہ پانی کا چھڑکاؤ کرتے گنگنانے لگی۔

"تو ہے پگلی کہیں کے لوگ سکھی۔"

☆ ☆ ☆

"نفوس کے ہوتے ہوئے بھی وہاں مکمل خاموشی تھی۔ علاوہ پنکھے کی ہلکی سی سرسراہٹ کے اور سالار کے کانٹے، چمچے کے کبھی کبھار آپس میں ٹکرانے کی آواز کے...

سالار اعظم اپنی مخصوص سنجیدگی کے ساتھ کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ اس سنجیدگی بھرے تاثرات

میں ہلکی سی تھکن کی آمیزش لیے اس کے سامنے بیٹھی اماں جان کھانے کے دوران گاہے بگاہے اس پہ نظر ڈال لیتی تھیں جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہوں 'مگر سالار نے ایک بار بھی نظر اپنی پلیٹ سے نہیں ہٹائی تو انہیں ناچار گفتگو میں پہل کرنے کی ہمت کرنی پڑی۔

"میں سوچ رہی تھی کچھ دنوں کے لیے نورین کے پاس چلی جاؤں۔"

"چلی جائیں۔" بنا نظر اٹھائے اس نے کہا۔

"لیکن پھر بات کچھ دنوں کی نہیں رہے گی وہ جلد واپس نہیں آنے دے گی۔ روز روز اتنا سفر کر کے میں امریکا جا بھی تو نہیں سکتی۔"

وہ رکیں کہ شاید وہ کچھ کہے 'مگر وہ اب پلیٹ میں مزید سلاد لے رہا تھا انہیں شبہ سا ہوا کہ پتا نہیں اس نے ان کی بات سنی بھی ہے یا نہیں۔

"اور وہ امید سے بھی ہے۔۔۔ سوچتی ہوں۔ ایک دو مہینے رک جاؤں۔۔۔ اکتوبر میں جاتی ہوں تاکہ اس کی ڈلیوری کے دوران اس کے پاس رہوں۔"

وہ پھر سے رک کر کسی جواب کی آس لیے اسے دیکھنے لگیں 'مگر اب وہ اپنے فون پہ کوئی میسج پڑھ رہا تھا۔

"تم کیا کہتے ہو؟"

ان کے تیسری بار مخاطب کرنے پہ سالار کے چہرے پہ واضح بے زاری نظر آنے لگی۔

"میں کیا کہوں جیسے آپ کی مرضی۔۔۔ جب جانا چاہیں 'بتا دیں۔۔۔ میں ٹکٹ بنوا دیتا ہوں۔"

"تمہاری بہن شادی کے چھ سال بعد پہلی بار امید سے ہے اور تم نے اسے ایک بار بھی فون نہیں کیا۔"

"میرے فون کرنے سے کیا ہو گا۔" وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"اسے خوشی ہو گی بیٹا۔"

"اسے خوش رکھنا میری ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے۔" وہ رکھائی سے کہتا آگے بڑھا۔ اماں جان کے چہرے کی تھکن مزید بڑھتی ہوئی نظر آنے لگی۔

پھر سالار کو کچھ خیال سوجھا اور وہ رک کر کہنے لگا۔

"آپ ایک دو دن میں طے کر لیں کہ آپ کو ابھی جانا ہے یا دو ماہ بعد۔۔۔ کیوں کہ مجھے ایک کام ہے آپ کے ہوتے ہوئے ہو جائے تو بہتر ہو گا ورنہ مجھے دسمبر تک انتظار کرنا ہو گا آپ کے واپس لوٹنے کا۔"

وہ کم ہی اتنی طویل بات کرتا تھا ان سے۔

"کیا کام؟"

"شادی کرنا ہے مجھے۔"

مختصر جواب دے کر وہ انہیں حیران پریشان چھوڑ کے اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

ام ہانی اسی خواب جیسے پل کے سحر میں تھی۔ ہونٹوں پہ وہی انگلی اب تک یوں دھری تھی کہ صبح سے رات ہو گئی۔ وہ ایک لفظ تک نہ کہہ پائی۔ سعد کی کال دوبارہ آئی۔ فون بجتا رہا 'مگر وہ کیا بات کرتی کیسے کرتی۔

یونہی بستر پہ کروٹیں بدلتے بدلتے اس بانسری کی صدا پھر سے سنی تو بے چین ہو کے کمرے سے نکلی اس کی توقع کے عین مطابق سلمیٰ برآمدے کے فرش پہ بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی۔

"اسے کوئی منع کر دے ہانی بی بی نہ چھیڑے ایسے سر۔ نہ بلائے مجھے۔ میں نہیں جا سکتی اس سے ملنے۔"

"نہیں جاؤ گی تو وہ ایسے ہی ساری رات بانسری بجا بجا کے تمہیں پکارتا رہے گا۔" وہ اس کے پاس ہی فرش پہ بیٹھ گئی۔

"تب اس نے ساری رات نہیں ساری عمر ہی میری راہ تکنی ہے۔ بیگم صاحبہ نے ابھی بتایا ہے۔ اس چودھویں کو وہ میرا نکاح کر رہے ہیں۔"

"تو تم انہیں بتا دو انہیں تمہاری شادی ہی کرنی ہے تو خدا داد سے کر دیں۔"

"نہیں کریں گے جی۔۔۔ حویلی کی نوکرانیوں کی شادیاں حویلی کے ملازموں سے ہی ہوتی ہیں تاکہ وہ ہمیشہ یہیں رہیں اور پھر ان کے بچے بھی۔۔۔ ہم نسل در نسل غلام رہتی ہیں بی بی۔۔۔ اور خدا داد۔۔۔ وہ ذات کا

کمہار ہے۔۔۔ میرے لیے سب چھوڑ چھاڑ کے حویلی کی چاکری کرنے بھی گیا تو کرے گا کیا؟ نکھٹو کو سوائے صراحیاں گھڑنے اور بانسری بجانے کے آتا ہی کیا ہے۔"

اسے روتا دیکھ کے ام ہانی کا دل بھی بھر آیا۔

"تو اب کیا ہو گا سلمیٰ؟"

"جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے ہانی بی بی۔۔۔ جدائی۔"

ایک تیر سا ام ہانی کے دل کے پار ہو گیا۔ وہ تڑپ کے اٹھی اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی جہاں فون نجانے کب سے بج رہا تھا۔

"کہاں تھی تم۔۔۔ کب سے فون کر رہا ہوں؟" اس کی آواز سن کے میں جی اٹھا ورنہ صبح سے ان ہی ریت کے بگولوں میں تنکا بنا اڑ رہا تھا۔

"بس۔۔۔ ایسے ہی۔۔۔ دل نہیں لگ رہا تھا۔۔۔ عجیب سی ایک اداسی تھی تو ٹہلنے چلی گئی۔"

"مجھے پتا ہے کیوں پریشان ہو تم؟"

"کیا پتا ہے؟" وہ چونک اٹھی تھی۔ اس کی دھڑکنیں تیز ہونے کی آواز مجھے فون پہ بھی سنائی دیں۔

"کیوں کہ میں ٹھیک نہیں ہوں۔ طبیعت خراب ہے میری۔"

میں نے پورے وثوق سے کہا اور وہ پریشان ہو گئی۔

"اوہ۔۔۔ کیا ہوا تمہیں؟"

"یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے مجھے تو فوراً" پتا چل جاتا ہے اگر تمہاری طبیعت خراب ہو تو یا تم پریشان ہو جیسے ابھی بھی میں جان گیا ہوں۔ اب بتاؤ۔۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں نا؟"

"نہیں۔۔۔ میں تو بس وہ سلمیٰ کی وجہ سے۔۔۔ خیر چھوڑو بہت رات ہو گئی۔ تم سو جاؤ۔"

"نہیں۔ تم کہو۔" میں جانتا تھا اس کے دل پہ بوجھ ہو گا تو وہ سو نہیں پائے گی اس لیے اسے اکسانے لگا۔

"تم کہو ہنی میں ساری رات بھی سن سکتا ہوں۔"

"ساری رات؟"

"بس تم بولتی جاؤ۔۔۔ کچھ بھی۔۔۔ چاہے سلمیٰ کے بارے میں ہی سہی۔" اور وہ کہتی رہی۔۔۔ میں سنتا رہا۔۔۔ یہاں تک کہ اس کی ہی آواز نیند سے بوجھل ہو گئی۔ فون بند کرنے کے بعد میں بھی بڑی طمانیت سے آنکھیں موند کے لیٹ گیا جیسے میں نے اس کی پریشانی سنی نہ ہو۔ بلکہ خود پہ لے لی ہو۔

اگلی صبح کئی روز کے بعد میں قدرے حواسوں میں تھا۔۔۔ جاگنگ کے دوران یہ بات نوٹ کرکے شعیب نے فوراً" پوچھ بھی لیا۔

"وہ اس لیے کہ جان گیا ہوں۔۔۔ کل بیٹھے بٹھائے میرا کیا کھو گیا تھا۔"

"کیا کھو گیا تھا؟"

"اس کی ہنسی۔۔۔" شعیب میرے جواب پہ مسکرا دیا۔۔۔ میں اسے یقین دلانے لگا۔

"ہاں شعیب وہ اداس تھی نا اس لیے میں خالی خالی سا ہو گیا تھا۔"

☆ ☆ ☆
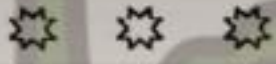
"بلیک کافی۔۔۔"

سالار نے اخبار کھول کے اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے ملازمہ سے کہا۔ اماں بیگم خاموشی سے ملازمہ کو اس کے سامنے کافی رکھتے اور سلائس پہ پی نٹ بٹر لگاتے دیکھتی رہیں اور جیسے وہ کچن کی جانب مڑا پوچھنے لگیں۔

"سالار۔ کون ہے وہ لڑکی؟" سالار نے اخبار چہرے سے ہٹا کے انہیں ایسی عجیب سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ وہ خود تذبذب میں آگئیں کہ شاید انہوں نے کوئی بہت ہی نامعقول بات پوچھ لی ہے۔

"وہی۔ جس سے۔۔۔ جس لڑکی سے تم شادی کرنا چاہتے ہو۔" گڑبڑا کے انہوں نے وضاحت دی مگر اس وضاحت نے سالار کی پیشانی کے بلوں میں کچھ اور اضافہ کر دیا۔

"آپ جان کے کیا کریں گی؟" سالار کے خشک لہجے کے جواب میں ان کا لہجہ مزید کمزور اور پھنسا پھنسا ہوا۔

"ماں ہوں تمہاری۔" سالار کے چہرے کی ناگواری

چھلک چھلک جارہی تھی۔ کافی کا آخری گھونٹ بھرتے اخبار تہہ کرکے واپس میز پہ رکھتے اور میز سے اپنا چشمہ اور فون اٹھا کے کھڑے ہوتے، سالار کو وہ خاموشی سے دیکھتی گئیں اور پھر مایوس انداز میں کہہ اٹھیں۔

"تو نہیں بتاؤ گے۔" جاتے جاتے سالار رکا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی سراسر احسان جتاتے انداز میں بتانے لگا۔

"ام ہانی۔ یہیں رہتی ہے۔ اچھے گھرانے کی ہے۔"

"خود بھی بہت اچھی ہوگی۔ مجھے یقین ہے میرے بیٹے کا معیار بہت اونچا ہے۔ خدا اسے تمہارے اور تمہیں اس کے حق میں بہت نیک اور مبارک کرے۔"

وہ جانتی تھیں کہ وہ ان کے دعا مکمل ہونے سے پہلے ہی یہاں سے جاچکا ہوگا۔ پھر بھی دل کھول کے خدا کے حضور دعائیں مانگنے لگیں۔

☼ ☼ ☼
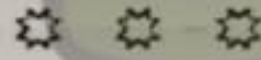
دونوں اس نہر کے کنارے اس بڑے سے پتھر پہ بیٹھے تھے۔ سالار اسے دیکھتا جارہا تھا اور وہ اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کو۔

"کیا سوچ رہی ہو۔"

"کچھ خاص نہیں۔ سلمٰی کے بارے میں۔"

"سلمٰی؟"

سالار کے ماتھے پہ شکن نمودار ہوگئی۔

"یہ کون ہے جسے تم میرے ساتھ بیٹھ کے سوچ رہی ہو۔"

"ہماری ملازمہ؟"

ام ہانی کے سادگی سے کہنے پہ اب سالار کو اپنی برہمی چھپانا مشکل لگنے لگا۔

"ملازمہ؟ ام ہانی۔ آج سے تمہاری سوچوں میں ایسے لوگوں کا داخلہ ممنوع ہے۔"

اس کے لہجے میں ایسی واضح تنبیہہ تھی کہ وہ گڑبڑا اٹھی۔

"نہیں۔ میں تو بس ایسے ہی۔ دراصل وہ جسے پسند کرتی ہے۔ وہ۔۔۔"

سالار نے اس کی بات درشتگی سے کاٹ دی۔

"وہ کسے پسند کرتی ہے، کسے نہیں یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ تمہارے لیے بس یہ جاننا اہم ہے کہ مجھے یہ بات بالکل بھی پسند نہیں ہے کہ تم میرے ساتھ ہوتے ہوئے کسی اور کے بارے میں سوچو بھی۔"

پل بھر میں وہ مہربان سے اتنا نامہربان ہو جاتا تھا کہ ام ہانی سہم جاتی تھی۔ اب بھی چپ چاپ سر جھکا کے رہ گئی۔ سالار اسے غور سے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"اب رو دو گی؟"

"نہیں تو۔" آنسوؤں سے رندھی آواز میں بولی۔

"ام ہانی۔ میں اپنے قیمتی وقت میں سے یہ لمحے نکال کے تمہارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ تم اپنی بات کہو۔ میری سنو۔" اس کا لہجہ پھر سے مہربان پا کے وہ ہلکی پھلکی ہو گئی۔ پھر تمہید باندھتے ہوئے کہنے لگی۔

"پتا ہے سالار۔ کچھ دن پہلے گھر میں میری شادی کی بات چلی تھی۔ میرا ایک کزن۔"

اور سالار کو اس کی بات کاٹنے کا جیسے شوق سا لاحق ہو چکا تھا۔

"وہ جو بھی ہے اس کی قسمت میں صرف مایوسی اور ناکامی ہے۔۔۔ میں نے کہا ناں۔۔۔ تم میری ہو چکی ہو۔"

"ہاں۔ ٹھیک کہتے ہیں آپ۔" وہ مسکرائی۔

"تقدیر نے شاید اسی لیے اس بات کو شروع ہونے سے پہلے ختم کر ڈالا۔ مگر گھر میں سب سنجیدہ ہیں اب۔ وہ میری شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" اس کی سادہ سی بات نے ام ہانی کو اتنا بڑا دلاسا دیا کہ وہ مطمئن سی ہو گئی۔ اس کی نظر نہر کے پار والے جامن کے درخت پہ گئی۔ جس کی شاخوں میں شام کی لالی سے لڑتا سورج دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں سالار نے بھی اسی جانب نظر اٹھائی۔

"وہاں کیا دیکھ رہی ہو؟"

"وہ دیکھیں۔ سورج کی لالی۔ اور۔ اس درخت کی شاخوں میں سے جھلکتا یہ منظر کتنا خوب صورت لگ رہا ہے۔"

ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ سالار اٹھ کے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کچھ اس طرح کہ اس کے وجود نے ام ہانی کی بصارت کی آخری حد کو بھی اپنے حصار میں لے لیا۔ اب ام ہانی کو صرف وہ اور صرف وہ ہی نظر آ رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد بھی۔۔۔

اور حویلی واپس آنے کے بعد بھی۔۔۔

بس وہی نظروں میں سمایا ہوا تھا۔ جیسے پتلیوں میں جم کے رہ گیا ہو۔

"ہانی بی بی۔ ہانی بی بی۔"

سلمٰی کے روتے ہوئے پکارنے پہ اس کی محویت ختم ہوئی۔ وہ روتی بلکتی باہر سے آ رہی تھی۔

"وہ مر جائے گا ہانی بی بی وہ تو سن کے ہی مرن جوگا ہو گیا۔ آپ نے ہی کہا تھا کہ اس سے مل کے آؤں۔ اسے بتاؤں۔ کہ میں کسی اور کی ہونے جا رہی ہوں۔ شاید وہ کچھ کرے۔۔۔ نہیں ہانی بی بی۔۔۔ وہ کیا کرے گا کچھ۔۔۔ وہ تو اگلا سانس لینے جوگا بھی نہیں رہا۔"

وہیں فرش پہ اس کے سامنے بیٹھ کے وہ بین ڈالنے لگی۔

"پتا نہیں کس دل سے میں نے اسے بتایا۔ وہ کچھ نہیں کر سکے گا ہانی بی بی۔ اب میں کسی اور کی ہو جاؤں گی۔"

"جب کسی کے ہو جاتے ہیں۔۔۔ سلمٰی۔ تو بس ہو جاتے ہیں۔۔۔" یہ ام ہانی نہیں۔ اس کے اندر۔ اندر سالار اعظم بول رہا تھا۔

"نہیں بی بی۔ جب ہمارا ہونا یا نہ ہونا ہی ہمارے بس میں نہیں ہے تو کسی کا ہونے پہ کیا زور۔ میں کم ذات۔ اسی حویلی کی تو شہزادیاں بھی رواتیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔۔۔ آپ نے دیکھا نہیں مہ پارہ بی بی کی جوانی کیسے رل گئی۔۔۔ برابر کا جوڑ نہ ملنے پہ۔ تو بھلا ایک کمی کمیں کی کون سنے گا۔"

امیر ہانی کا دل سکڑ گیا۔ وہ اٹھی اور اندر جاتے ہی

فون پہ نمبر ملانے لگی۔
اور میں کھل اٹھا۔
"جب سے آیا ہوں۔ پہلی بار تم نے فون کیا ہے مجھے ورنہ ہمیشہ میں ہی کرتا ہوں۔"
"سنو۔ تم سے ایک کام تھا۔" وہ بہت سنجیدہ لگ رہی تھی۔
"کچھ منگوانا ہے میں نے۔"
"کہو ناں۔۔۔ کیا چاہیے۔۔۔ یہاں لاہور میں بہت اچھی اچھی چیزیں ملتی ہیں۔۔۔ جو کہو گی۔۔۔ لادوں گا۔"
میں پرجوش ہو گیا۔ وہ بھلا کہاں کرتی تھی فرمائشیں۔
"چوڑیاں۔"
"ہاں۔ ضرور۔ بہت ڈھیر سی۔ کون سے رنگ کی۔"
"نہیں بدھو۔ وہ والی۔۔۔ منت کی۔۔۔ وہ جو تم بتا رہے تھے کہ ان کو پہننے سے۔ اوفوہ۔ تم نے ہی تو کہا تھا۔" وہ جھجکی۔۔۔ پھر ہچکچائی۔۔۔ پھر جھلا کے کہہ اٹھی۔
مجھے ہنسی آگئی۔
"اچھا۔ وہ جن کو پہننے سے نہ صرف شادی جلدی ہو جاتی ہے بلکہ وہیں ہو جاتی ہے جہاں خواہش ہو۔"
"ہاں۔"
"یار اپنے لیے منگواؤ ناں کچھ۔ میں نہیں لانے والا سلمٰی کے لیے۔" میں مایوس ہو گیا۔ منگوایا بھی کچھ تو سلمٰی کے لیے۔
"سلمٰی کے لیے نہیں۔ اپنے لیے منگوا رہی ہوں بدھو۔"
"سچ؟" میں ہواؤں میں اڑنے لگا۔
"صبح ہی لے کر آتا ہوں۔"
اور اس نے جلدی آنے سے منع بھی نہیں کیا۔
میں اسی رات پیکنگ کرنے لگا۔
"اب بیٹھے بٹھائے چل پڑے ہو۔ ویک اینڈ پہ چلے جانا۔" شعیب نے مجھے بیگ میں کپڑے ٹھونستے دیکھ کے بلاوجہ کا مشورہ دیا۔
"چپ کر۔ ویک اینڈ میں تین دن باقی ہیں۔ میں نہیں رک سکتا۔ پہلی بار تو اس نے مجھ سے کچھ مانگا ہے۔"
"اور وہ بھی تمہارے مطلب کا۔"
"ہاں۔ اور ابو بھی دو دن کے لیے کراچی گئے ہوئے ہیں انہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ میں صبح جاؤں گا۔ اگلی صبح واپس۔"
اور پھر بیڈ پہ گر گیا۔ اس کے ملنے کے تصور نے میرے وجود میں عجیب سی سرشاری بھر دی تھی۔
"شعیب۔ دیکھ۔۔۔ اسے ملنے کے خیال سے ہی مجھ میں جان پڑ گئی ہے۔ جی اٹھا ہوں۔"
"میں نے تجھے کہا تھا ناں سعد۔ کبھی کبھی جدائی کچھ نہیں کہتی۔ قربت مار دیتی ہے۔"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)